وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا

بیاد : سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

عالمی ترجمان القرآن

اپریل ۲۰۱۴ء

مدیر : پروفیسر خورشید احمد

الابلاغ ٹرسٹ

ماہنامہ عالمی

ترجمان القرآن

جلد۴، عدد ۴، جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ، اپریل ۲۰۱۴ء

مدیر: پروفیسر خورشید احمد — نائب مدیر: مسلم سجاد

ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰ فون: ۰۴۲-۳۵۴۲۵۳۵۶ فیکس: ۳۵۴۳۲۱۹۴ - tarjumanq@gmail.com

انتظامی امور: ۳۳- زینب پارک، نزد منصورہ، لاہور-۵۴۷۹۰- فون: ۰۴۲-۳۵۴۲۷۹۱۶- فیکس: ۳۵۴۲۷۹۱۵

موبائل: ۰۳۰۷-۴۱۱۲۷۰۰ ای میل: tarjuman@tarjumanulquran.org ویب: www.tarjumanulquran.org

● قیمت فی شمارہ: ۳۵ روپے ● زرسالانہ: ۳۵۰ روپے ● ۵ سال کے لیے: ۱۵۰۰ روپے ● معاون خصوصی: ۶۰۰۰ روپے

● بنگلہ دیش، بھارت ۱۴۰۰ روپے ● ایران، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۸۰۰ روپے ● امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۲۱۰۰ روپے

بنک اکاؤنٹ: بنام عالمی ترجمان القرآن، BOP, Ichhra, Br. Code 093, Lahore A/c 800-792-000-0

زیراہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

نظامِ حیات کا بگاڑ: اصل وجہ

ہماری قوم کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ جب بھی مغرب سے اسلام کے کسی نظریے کی تائید ہو جاتی ہے تو لوگ اُسے بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور پھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب میں بس یہی ایک بیماری ہے جس کو مغربی حکیم نے بیان کر دیا ہے اور اسلام کے شفاخانے سے حاصل کی ہوئی دوائی کا ایک گھونٹ مغربی نظامِ اجتماعی کو بالکل تندرست و توانا کر دے گا۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ آج کل سُود کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ لارڈ کینز اور اس کے ساتھیوں نے سود کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کیا ہے، اس سے بعض مفکرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بس یورپ کے معاشی عدمِ توازن اور بحران کا واحد سبب یہی ہے اور اگر یہ کانٹا اس کے پہلو سے نکل جائے تو پھر مریض رُوبصحت ہوگا۔ مگر آپ یقین کریں کہ اس لعنت کو ختم کرنے کے بعد بھی یورپ کا یہی حال رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو تنہا سُود اور نہ کوئی دوسرا ایک محرک اس تباہی کا ذمہ دار ٹھیرایا جاسکتا ہے۔ ان کی حیثیت تو ذرائع کی سی ہے جن کو مغربی تہذیب کے معماروں نے اپنی زندگی کی تعمیر میں استعمال کیا ہے۔ یورپ کی بربادی، اور اس کے ساتھ ہماری تباہی کا اصل سبب وہ تملیکی ذہنیت (acquisitive mentality) ہے جسے تہذیبِ جدید نے نہایت ہی شدت کے ساتھ اپنے پرستاروں میں پیدا کیا ہے۔ سود تو اس ذہنیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ جب تک اس مادہ پرستانہ ذہنیت کو بدل کر ایک خدا پرستانہ ذہنیت پیدا نہیں کی جاتی، حالات کا درست ہونا بالکل ناممکن ہے۔ آپ جتنا غور کریں گے اتنا ہی اس حقیقت کو درست پائیں گے۔ یورپ کے نظامِ حیات کے بگاڑ کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے خدا کو چھوڑ کر پونڈ اور ڈالر کو اپنا رب تسلیم کیا ہے۔ اسی بنا پر اُس کے ہاں ذی روح انسانوں کی قیمت گر رہی ہے، مگر بے جان دھاتوں کی قدر بڑھ رہی ہے۔ (’رسائل و مسائل‘، عبدالحمید صدیقی، ترجمان القرآن، جلد ۴۲، عدد ۱، رجب ۱۳۷۳ھ، اپریل ۱۹۵۴ء، ص ۶۵-۶۶)

اشارات

عرب دنیا میں اسلامی تحریکات ـــــ آزمایش کا نیا دور

پروفیسر خورشید احمد

دعوتِ اسلامی اور آزمایش کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے اور بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلانے کی دعوت و تحریک کو کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا گیا۔ اقبال نے تاریخ کی گواہی کو کس خوب صورتی سے بیان کیا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

اور اللہ تعالیٰ نے خود بھی اپنی راہ میں جدوجہد کرنے والے بندوں کو آگاہ کر دیا تھا، بلکہ بہ الفاظ صحیح تر متنبہ کر دیا تھا کہ کامیابی کی منزل کش مکش، آزمایش اور ابتلا کے مراحل سے گزر کر ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بار بار خاک و خون کے دریا پار کرنا ہوں گے اور پھر ان شاء اللہ آزمایش کی بھٹی میں سونے کو سہاگا بنانے والے اس عمل سے گزرنے والوں ہی کو غلبہ و کامیابی نصیب ہوگی۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ○ (العنکبوت ۲۹:۲-۴) کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالاں کہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمایش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچّے کون ہیں اور جھوٹے کون۔ اور کیا وہ لوگ جو بُری حرکتیں کر رہے ہیں یہ سمجھے بیٹھے ہیں

کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں۔

پھر اللہ نے اپنے بندوں کو یہ بھی بتا دیا کہ کس کس قسم کی آزمایشوں سے ان کو گزرنا پڑے گا:

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ط وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قف وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۱۵۵-۱۵۷) اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمایش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے''۔ انھیں خوش خبری دے دو۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں۔

مقابلے کا راستہ بھی بتا دیا کہ وہ صبر اور صلوٰۃ کا راستہ ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ○ (البقرہ ۲:۱۵۳) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ گویا استقامت اور دعوتِ حق پر قائم رہنا اور شر اور ظلم و زیادتی کا بھی خیر اور صلاح کے ذریعے مقابلہ کرنے میں کامیابی کا راستہ ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ج وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ○ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ○ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ

عَظِیْمٍ ○ (حٰم السجدہ ۴۱:۳۰-۳۵) جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہوجاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمھیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمھاری ہوگی، یہ ہے سامانِ ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور و رحیم ہے"۔

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبیؐ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اُکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

آزمایش اور مقابلے کی حکمت عملی

ان آیاتِ مبارکہ میں ہمارے رب نے ہمیں ان مراحل سے بھی آگاہ کردیا جن سے اہلِ حق کو گزرنا پڑتا ہے، اور ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے صحیح حکمت عملی اور راہِ عمل کی طرف بھی رہنمائی فرما دی جس کے ذریعے مخالفتوں کا مقابلہ کیا جانا چاہیے۔ جواب میں انتقام اور بدی کے بدلے بدی کا راستہ اختیار کرنے سے منع فرما دیا اور صبر و استقامت اور حق و شرافت کے ہتھیاروں سے غلط فہمیوں کو دُور کرنے اور انسانوں کے دل میں خیر کا جو عنصر ودیعت کیا گیا ہے، اسے بیدار کر کے نیکی کی راہ کو غالب کرنے کی جدوجہد کو اختیار کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے۔ واضح رہے کہ صبر و استقامت کا راستہ عدل و انصاف سے عبارت ہے۔ انتقام اور ظلم و زیادتی اختیار کرنا مقصد کو فوت کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، اور انسانی زندگی ایک خرابی کے بعد دوسری خرابی کی آماج گاہ بن جاتی ہے۔ اصلاح اور خیر کا راستہ بدی کو نیکی اور بھلائی سے دُور کرنا ہے اور جہاں غلط کار قیادت

اور اُولی الامر کے غلط فیصلوں اور اقدام پر مداہنت کا راستہ بند کیا ہے، وہیں اصلاحِ احوال کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے ہی کو اختیار کرنے اور اس پر قائم رہنے کی ہدایت کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝ (النساء ۴:۵۹) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہوجائے تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

تمام اہلِ ایمان کو خواہ وہ اصحاب امر ہوں یا عام افراد، عدل و انصاف پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی ہدایت فرمائی گئی ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؗ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ ۵:۸) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

عالمِ عرب اور اخوان

اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو 'اُمت وسط' قرار دیا ہے اور اُمت کے افراد کے درمیان بلالحاظ رُتبہ، نسل، اور حیثیت، وحدت اور اخوت کا رشتہ قائم کیا ہے اور ان کے باہمی تعلقات کو رحماء بینھم کے حسنِ تعلّق کی شکل میں بیان فرمایا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کا

خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:

اَلدِّیْنُ نَصِیْحَہ ـــــ دین ایک دوسرے کی خیرخواہی کا نام ہے۔

اصحابِ رسول رضوان اللہ اجمعین نے پوچھا: لمن؟ ''کن سے؟''

آپؐ نے فرمایا:

لِلّٰہِ، ولِرَسُولِہٖ وَلِکِتَابِہٖ ولائِمَّۃ المُسْلِمِیْنُ وَعَامَتَھُمْ

اللہ سے، اللہ کے رسولؐ سے، اللہ کی کتاب سے، مسلمانوں کے اولی الامر سے اور عام مسلمانوں سے۔

نصیحت کا یہی وہ تعلّق ہے جس کی بنا پر ہم مسلمان حکمرانوں، خصوصیّت سے عرب دنیا کے حکمرانوں کو پوری دل سوزی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں کہ مصر میں عالمِ عرب کی سب سے بڑی اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے ساتھ اس وقت جو ظلم ہو رہا ہے، نہ اس پر خاموش تماشائی بنیں اور نہ کسی طرح بھی اور کسی شکل میں بھی ظلم کرنے والوں کے لیے تقویت کا ذریعہ بنیں۔ صحیح راستہ اس ظلم کو رُکوانے اور مصر کی حکومت کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کا ہے جس کے لیے ہر صاحبِ امر اور صاحبِ خیر کو متحرک ہونا چاہیے۔ اُمت مسلمہ کا اجتماعی ضمیر اس باب میں یکسو ہے کہ جس طرح مصر میں ایک منتخب صدر کو ہٹایا گیا ہے اور پھر جس طرح اخوان المسلمون اور دوسرے تمام جمہوریت پسند عناصر کو نشانۂ ظلم وستم بنایا جارہا ہے وہ حق وانصاف کا خون ہے اور خود مصر اور عالمِ عرب کے مفاد سے متصادم ہے۔

اسلام اور اسلامی تحریکات کے خلاف جو عالم گیر جنگ امریکا اور اس کے اتحادیوں نے برپا کی ہوئی ہے اور جس کی فکری نکیل اسرائیل اور صہیونی عناصر کے ہاتھ میں ہے، ہمارے حکمرانوں کو اس ناپاک کھیل کو سمجھنا چاہیے اور تصادم کی جگہ افہام وتفہیم کے ذریعے اسلامی اقدار کی پاس داری، ملک کے دستور اور قانون کے احترام اور جمہوری روایات کے فروغ کے راستے کو اختیار کرنا چاہیے۔ اس میں سب کے لیے خیر ہے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر عرب اور مسلمان ملک اپنی آزادی، سلامتی اور اسلامی شناخت کی حفاظت کرسکتے ہیں۔

اخوان المسلمون ایک نظریاتی، اصلاحی اور جمہوری تحریک ہے۔ غلطی سے پاک کوئی انسانی

کوشش نہیں ہوسکتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اخوان المسلمون ایک خیر کی دعوت ہے، اور اس نے اپنی ساری جدوجہد اسلامی مقاصد کے حصول کے لیے اخلاقی آداب اور معروف جمہوری روایات کے دائرے میں انجام دی ہے، اور عرب اور مسلم دنیا کے حقیقی مفادات کے تحفظ اور مسئلۂ فلسطین کے منصفانہ حل کے لیے اس کی خدمات نوشتۂ دیوار ہیں۔ مصر میں فوجی حکمران اسے جس طرح نشانہ بنائے ہوئے ہیں، وہ ایک صریح ظلم اور خود مصر، فلسطین اور عالمِ عرب کے حقیقی مفادات پر ضربِ کاری ہے۔ ان حالات میں مظلوم کی مدد تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔

اس پس منظر میں ہمیں اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور بحرین کی حکومتوں کا مصر کی تقلید میں اخوان المسلمون اور حماس کو 'دہشت گرد' تنظیمیں قرار دینا نہایت تکلیف دہ اور افسوس ناک ہے۔ الدین نصیحۃ پر عمل کرتے ہوئے ہم پوری دل سوزی سے ان تمام حکمرانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اپنے رویے پر نظرثانی کریں اور حق وانصاف کے تقاضوں کی پاس داری کرتے ہوئے اس روش کو تبدیل کریں اور خود مصر میں اصلاح احوال کے لیے مثبت کردار ادا کریں، ورنہ اُمت میں مزید انتشار بڑھے گا اور حکمرانوں اور عوام میں خلیج وسیع تر ہوگی، اور خود عرب ممالک میں اختلاف اور تقسیم در تقسیم کی کیفیت پیدا ہوگی، جو اُمت کے مفادات کے خلاف ہے اور جس سے ہمارے دشمنوں کے عزائم کو تقویت ملے گی۔

اخوان المسلمون کا موقف

اخوان المسلمون کوئی خفیہ تنظیم نہیں۔ وہ ۱۹۲۸ء سے دعوت و اصلاح کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ ہزاروں صفحوں پر پھیلا ہوا اس کا لٹریچر، اس کی فکر، دعوت، طریق کار اور خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس نے ابتلا اور آزمایش کے اَدوار میں بھی اپنے اصولی، اصلاحی، اخلاقی اور جمہوری مسلک پر پوری استقامت سے قائم رہ کر عوام کے دلوں میں اَنمٹ مقام بنالیا ہے۔ محض مغربی اقوام کے پروپیگنڈے اور [illegible] میں جمہوریت کا خون کرنے والے عناصر کے بیانات سے اخوان المسلمون کی ۸۰ سالہ جدوجہد کو پادر ہوا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم مصر کے حکمرانوں سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ شخصی اقتدار کی خاطر مصر، فلسطین، عرب دنیا اور مسلم اُمت کے حقیقی مفادات کو قربان نہ کریں، اور تصادم کی جگہ حق وانصاف پر مبنی مفاہمت کی راہ اختیار کر کے تمام سیاسی اور دینی قوتوں کو

ساتھ لے کر چلنے کا راستہ اختیار کریں، اور ان عرب ممالک کے ارباب حل و عقد سے بھی اپیل کرتے ہیں جو اخوان کی مخالفت کے ناقابلِ فہم راستے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور مسلمان عوام میں اضطراب اور مایوسی میں اضافہ کرنے کا باعث ہو رہے ہیں کہ وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کریں۔

اخوان المسلمون نے چند عرب حکمرانوں کے حالیہ اعلان پر جس ردعمل کا اظہار کیا ہے، وہ بڑا محتاط اور اصلاحِ احوال کے لیے ایک حکیمانہ ردعمل ہے۔ اخوان المسلمون کے اس سرکاری بیان پر ٹھنڈے دل سے اور اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے، جس کی ہم اُمت مسلمہ کے تمام ہی اولی الامر کو خصوصیّت سے دعوت دیتے ہیں۔

اخوان المسلمون کے مطابق: ''سعودی وزارتِ داخلہ کی جانب سے اچانک اخوان کا نام دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کرنے پر اخوان المسلمون کو انتہائی حیرت ہوئی ہے۔ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ فیصلہ اس مملکت کی طرف سے سامنے آیا ہے، جسے عوامی مفادات کے تحفظ، اُمت مسلمہ کی وحدت، معاشرتی اور قومی تعمیر و ترقی میں مؤثر کردار ادا کرنے اور صحیح اسلامی فکر کی ترویج کے لیے اخوان کی کوششوں کا سب سے زیادہ علم ہے اور جس نے ان مساعی کو ہمیشہ سراہا ہے۔ سعودی عرب اس راستے میں اخوان کو پیش آنے والی تکالیف اور آزمایشوں سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔

اخوان اس حوالے سے درج ذیل وضاحت ضروری سمجھتی ہے:

۱- ملکی اُمور میں عدم مداخلت کے مستقل اصول پر قائم رہتے ہوئے ہم وثوق سے کہتے ہیں کہ سعودیہ کی جانب سے سامنے آنے والا حالیہ موقف، مملکت کے بانی کے دور سے لے کر آج تک جماعت کے ساتھ سعودیہ کے تعلقات کی پوری تاریخ کے بالکل برعکس ہے۔

۲- تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ الاخوان المسلمون کی جماعت ہر طرح کے غلو اور انتہاپسندی سے دُور رہتے ہوئے صحیح اسلامی فکر اور سوچ کی ترویج و اشاعت میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ اس امر کی گواہی مملکت کے متعدد اکابر علماے کرام اور حکام بھی کئی بار دے چکے ہیں۔

سعودی عرب میں بھی تمام لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ اخوان ہمیشہ علی الاعلان کہتی رہی ہے کہ جس حق پر وہ ایمان رکھتے ہیں، وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی تعلیمات سے ماخوذ طریقۂ کار ہے اور نص صریح اور دلیل واضح پر مبنی ہے۔

۳- اخوان، عالمِ اسلام کے ممالک کی سیاسی قیادت کے ساتھ واضح نظریاتی نقطہ ہاے نظر کی بنیاد پر تعامل کرتی ہے، جن میں سب سے اہم یہ اعتقاد ہے کہ ہمارے معاشرے مسلم معاشرے ہیں۔ ہمارے اور ان کے مابین اور ان مسلم معاشروں کی مختلف سیاسی قوتوں اور حکومتوں کے مابین نصیحت و خیرخواہی کا تعلّق ہے نہ کہ دوسروں کو کافر یا خائن قرار دینے کا۔ اخوان نہ تو کسی ملک کو کافر قرار دیتی ہے، نہ مرتد کہ جس کی وجہ سے وہ اس کی دشمنی اور تصادم مول لے۔ اسی اصول کی بنا پر سعودیہ کے ساتھ اخوان کا تعلّق بھی صرف اور صرف خیرخواہی اور مشورے پر مبنی ہے۔

۴- اخوان کو اپنے نظریات اور فکر پر فخر ہے اور تمام مسلم معاشروں کے عوام کے ساتھ وابستہ اپنی تاریخ پر بھی۔ اس نے ہمیشہ اسلام کے جامع مفہوم کو اپنی دعوت کی پہچان بنایا ہے اور آیندہ بھی اسے اپنا بنیادی تعارف قرار دیتے ہیں۔ اخوان تقریباً ہر مسلمان ملک میں اُمت کا حصّہ ہے اور اسی بنیاد پر وہ اُمت مسلمہ، عالمِ اسلام اور عوام کے مسائل حل کروانے کے لیے اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے۔

جماعت اخوان ہر شہری کی آزاد اور عزت بخش زندگی یقینی بنانے کے لیے سیاسی میدان میں ملک کے تمام شہریوں سے تعاون پر یقین رکھتی ہے۔ سیاسی، دینی یا مذہبی اختلافات کے باوجود مختلف قومی شخصیات و جماعتوں سے اشتراک و اتحاد کرتی ہے اور یہ واضح اعلان کرتی ہے کہ وہ اسلام کے نام پر لوگوں کی نگران یا ٹھیکے دار نہیں بنائی گئی۔ جماعت اخوان اعلیٰ اخروی ہدف رکھتی ہے اور اس کا حصول تمام نظریاتی، معاشرتی، سیاسی اور دینی گروہوں سے گفت وشنید کے ذریعے ہی ممکن سمجھتی ہے۔

اخوان خیرخواہی کی راہ پر چلتے اور ملک و قوم کے مفادات کے برعکس کیے جانے والے ہر اقدام کی مخالفت جاری رکھتے ہوئے یہ واضح کرتی ہے کہ وہ اپنی سیاسی اور اصلاحی جدوجہد کو کسی بھی ملک میں محض کسی حکمران کی مخالفت کی بنیاد پر شروع نہیں کرتی۔ وہ ہر قسم کے تشدد، ایذا رسانی اور انتہاپسندی سے دُور رہتے ہوئے حکمت پر مبنی دعوت اور خیرخواہی پر مبنی نصیحت پر یقین رکھتی ہے“۔

مسلم اُمّہ کا ردعمل

پاکستان کے عوام اُمت مسلمہ کی عظیم اکثریت کی طرح اخوان المسلمون کو مظلوم سمجھتے ہیں

اور چند عرب حکمرانوں کے اخوان کو دہشت گرد جماعت قرار دینے پر بے حد مغموم اور مضطرب ہیں۔ تمام اسلام پسند قوتیں تو اس پر دل گرفتہ اور شکوہ سنج ہیں ہی لیکن خود لبرل عناصر بھی اس پر اپنے انداز میں تنقید کر رہے ہیں اور عرب حکمرانوں کو اپنے رویے پر نظرثانی کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں روزنامہ ڈان کے ادارتی تبصرے کے چند اقتباس پاکستان کی مجموعی رائے عامہ جو ہر طبقے اور مکتب فکر کے دل کی آواز ہے، کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوں گے:

> سعودی عرب کے اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کے فیصلے سے قدامت پسند بادشاہت کے اُس وہم کے پیش نظر تعجب نہیں ہونا چاہیے، جو وہ نہ صرف انسانی حقوق اور جمہوریت کے لیے کھڑی ہونے والی تحریکوں بلکہ ان اسلامی گروپوں یا تحریکوں کے بارے میں بھی رکھتی ہے جو جمہوریت پر یقین رکھتی ہیں۔ اخوان المسلمون کا اپنا ایجنڈا ہو سکتا ہے اور اس کے اپنے اہداف اور مقاصد ہو سکتے ہیں جو زمانے کے تقاضے کے مطابق نہ ہوں، لیکن ایک طویل مدت سے حسن البنا کی قائم کردہ یہ جماعت اقتدار حاصل کرنے کے لیے جمہوری عمل پر یقین رکھتی ہے۔
>
> لیکن ریاض نے اخوان کی منتخب حکومت، جس کے سربراہ محمد مرسی تھے، کو برطرف کرنے والے فوجی انقلاب کو خوش آمدید کہا۔ صرف سعودی عرب ہی اس میں تنہا نہیں ہے۔ حالیہ دنوں میں خلیج کی دو اور بادشاہتوں ___ امارات اور بحرین ___ نے قطر سے اپنے سفیر واپس بلوا لیے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ قطر مصر میں غلط گھوڑے کی پشت پناہی کر رہا ہے۔
>
> سیاسی تحریکوں پر پابندیاں لگانے یا عسکریت پسند گروپوں کو پراکسی کے طور پر استعمال کرنے کے مؤثر ہونے کی اُمید نہیں۔ ان کے برعکس نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔ ان حکومتوں کی یہ ضرورت ہے کہ اپنے ممالک اور معاشروں میں وسعت پیدا کریں اور اختلاف رائے اور عوام کی مرضی کو جگہ دیں، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرقِ اوسط کے علاقے کی مطلق العنان حکومتوں کو اب اپنی داخلی اور علاقائی پالیسیوں پر ازسرِنو غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ تبدیلی لانے والی عرب بہار کا تقاضا ہے کہ

بنیاد پرستوں سے پہلے ہر ایک ازسرِنو غوروفکر کرے۔(روزنامہ ڈان،۱۰مارچ ۲۰۱۴ء)

یہ جذبات واحساسات صرف پاکستانی مسلمانوں ہی کے نہیں ہیں، درحقیقت پوری دنیا کے مسلم عوام کے ہیں جو بالعموم اور خصوصیّت سے دینی قوتیں مصر اور چند عرب ممالک کے اس رویے پر بے حد مایوس ہوئی ہیں اور اسے حق وانصاف کے خلاف اور اُمت مسلمہ کے مفادات سے متصادم سمجھتی ہیں۔ ان ممالک کے حکمرانوں اور اربابِ حل وعقد کو مسلمان عوام کے جذبات کے بارے میں ضروری حساسیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ بھارت کے مسلمانوں کے جذبات کا اندازہ نئی دہلی سے شائع ہونے والے Indian Muslims —— Home Slider کی اس رپورٹ سے ہوسکتا ہے جو ۱۵مارچ کو شائع ہوئی ہے:

اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے پر سعودی حکمرانوں کی مذمت برابر بڑھ رہی ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما کے بعد نمایاں مسلم علما اور تنظیموں نے سعودی حکومت کو اخوان اور حماس کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے پر سخت لتاڑا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سعودی حکمرانوں نے جو حرمین شریفین کے والی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، پوری دنیا میں مسلمانوں کو اپنے اس غیر منصفانہ اور خلافِ اسلام فیصلے سے تکلیف پہنچائی ہے۔

جماعت اسلامی ہند، مرکزی جمعیت علما، آل انڈیا دینی مدارس بورڈ اور بہت سی دوسری مسلم تنظیموں نے سعودی عرب کے مصر میں قائم ہونے والی اخوان المسلمون کو ایک دہشت گرد تنظیم قرار دینے کے فیصلے پر سخت تنقید کی ہے اور اُمید کی ہے کہ سعودی بادشاہت فوری طور پر فیصلے پر نظرثانی کرے گی۔ جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا جلال الدین عمری نے کہا کہ اخوان المسلمون نے جس تحریک کا آغاز کیا ہے وہ اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔ اس لیے اس پر پابندی یقیناً پوری مسلم دنیا کو تکلیف دے گی۔ انھوں نے کہا کہ اخوان المسلمون ایک بین الاقوامی اصلاحی اور سماجی تنظیم ہے، اور حماس وہ تنظیم ہے جو شرق اوسط میں صہیونی ریاست کا بے خوفی سے مقابلہ کر رہی ہے۔

ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا عیسیٰ منصوری، فتویٰ موبائل سروس کے مفتی محمد ارشد فاروقی، مدارس بورڈ کے سربراہ مولانا یعقوب بلندشہری اور جمعیت کے

سیکرٹری مولانا فیروز اختر قاسمی نے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ سعودی حکمرانوں نے اخوان المسلمون کو دہشت گرد قرار دے کر ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ انھوں نے شاہ عبداللہ اور سعودی عرب کے سرکردہ علما سے اپیل کی ہے کہ اخوان کے بارے میں اس فیصلے کو واپس لیں۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ ساری دنیا کے مسلمان سعودی عرب کے اس اقدام کی مذمت کریں گے اور مزاحمت کریں گے۔ انھوں نے اُمید ظاہر کی کہ سعودی علما سعودی حکمرانوں کو قائل کریں گے کہ وہ اس فیصلے کو واپس لیں۔ سعودی علما کا یہ فرض ہے کہ اپنے حکمرانوں پر اس حوالے سے دباؤ ڈالیں، اس لیے کہ تمام مسلمان اس اقدام پر مشتعل ہیں۔

انھوں نے توجہ دلائی کہ مسلمان سعودی عرب کا بہت احترام کرتے ہیں، اس لیے کہ یہاں اسلام کے مقدس مقامات موجود ہیں، جب کہ اس ملک کے مطلق العنان حکمرانوں کے لیے جو مغربی طاقتوں کے آلۂ کار ہیں، ان کے پاس کوئی محبت نہیں ہے۔ اس سے قبل دارالعلوم ندوۃ، لکھنؤ کا تاریخی ادارہ سعودی وفد کی آمد پر اس کی تحقیر کر کے اس ضمن میں سبقت لے گیا۔

اُمت کو درپیش چیلنج

اسلام اور اُمت مسلمہ کے دشمنوں اور مخالفین کی کوشش ہے کہ مسلمانوں میں انتشار اور تصادم بڑھے اور مسلمان اپنی تمام قوتوں کو یک جا کر کے اصل مخالفین کا مقابلہ کرنے کے بجاے ایک دوسرے کا گریبان چاک کرنے اور اندرونی خلفشار اور جنگ و جدال میں اُلجھ کر اپنی قوت کو پارہ پارہ کرلیں۔ ہنری کسنجر نے تو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں کہا تھا کہ: ''مشرق وسطیٰ کو قابو میں رکھنے اور اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے شرق اوسط کو فرقہ واریت اور لسانی اور نسلی گروہ بندیوں کی بنیاد پر تقسیم در تقسیم کیا جائے''۔

چار سال پہلے تیونس سے عوامی انقلاب اور عرب دنیا کی بیداری کی جو نئی لہر اُبھری تھی، اس نے مغربی دنیا میں خطرے کی گھنٹیاں بجادیں۔ ترکی اور عرب دنیا میں جو قربت ترکی میں طیب اردگان کی قیادت کی کوششوں سے رُونما ہورہی تھی، اس نے اسرائیل اور امریکا و یورپ کے

حکمرانوں کی نیندیں حرام کردیں۔ عراق اور افغانستان میں امریکی افواج کی ناکامی نے اس علاقے کے بارے میں جو امریکا اور یورپ کے عزائم تھے، ان کو خاک میں ملا دیا۔ ان حالات میں ایک بار پھر مسلمان اور عرب ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے اور عوام کو شیعہ اور سُنّی، ترک اور کرد، عرب اور عجم، بنیاد پرست اور لبرل، مسلمان اور قبطی کی تقسیم اور ان کے درمیان تصادم کی راہ پر ڈالنے کی سرتوڑ کوششیں ہورہی ہیں۔

ان حالات میں عوام اور حکمران سب کے لیے ضروری ہے کہ مخالفین کے کھیل کو سمجھیں اور اپنی صفوں میں انتشار اور خلفشار کو راہ نہ پانے دیں۔ ذاتی، گروہی اور دوسری عصبیتوں اور مفادات کی سطح سے بلند ہوں اور ایک دوسرے کو کھلے دل سے تسلیم کر کے مشترکات کی بنیاد پر تعاون کی راہیں استوار کریں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اسلام اور اُمت مسلمہ کے مفاد کی بنیاد پر نئی سوچ اختیار کی جائے اور مفاہمت اور تعاون کے ذریعے ایک دوسرے کی تقویت کا ذریعہ بنا جائے۔ ہم پوری دل سوزی سے مصر کے حکمرانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اخوان المسلمون اور دوسری اسلامی اور جمہوری قوتوں کو نشانہ بنانے کے بجاے انھیں اتحادِ اسلامی اور تعمیرنو کی جدوجہد میں اعوان وانصار کا درجہ دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں ان شاء اللہ سب کے لیے خیر اور استحکام کا حصول ممکن ہوگا، جو اُمت کی تقویت کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح مسلمان اپنے گھر کی اصلاح کے ساتھ انسانیت کی تعمیرنو میں ایک اہم کردار ادا کرسکیں گے۔

تھر پارکر کا المیہ

پروفیسر خورشید احمد

تھر پارکر کا صحرا دنیا کا چھٹا بڑا صحرا ہے، جو پاکستان اور بھارت میں مشترک ہے۔ پاکستانی حصہ ۲۲ ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے، جو چھے تحصیلوں پر محیط ہے اور اس کی آبادی ۱۵ لاکھ کے قریب ہے۔ زیادہ آبادی ۲ ہزار ۳ سو دیہات میں مکین ہے، جب کہ کچھ شہری آبادی بھی ہے۔ زیر کاشت رقبہ سوا تین لاکھ ایکڑ سے زیادہ ہے، جو آبادی کے ۲۰ فی صد کی ضرورتوں کو بمشکل پورا کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے خوراک کے باب میں عدم تحفظ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ہے اور ایک مستقل مسئلہ ہے۔ گلہ بانی یہاں کے لوگوں کا دوسرا بڑا پیشہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ۶۰ لاکھ مویشی اس علاقے میں ہیں، جو سندھ اور خصوصیت سے کراچی کی گوشت کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ البتہ مویشیوں کے لیے بھی چارے کا مسئلہ پریشان کن ہے، جو نتیجتاً مویشیوں میں مختلف نوعیت کی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق ۵ لاکھ سے زیادہ بھیڑ بکریاں sheep pax اور دوسری بیماریوں میں مبتلا ہیں اور علاج کی سہولتیں سخت ناکافی ہیں، جس کے نتیجے میں بہت سے بیمار مویشی انسانی غذا کا حصہ بنتے ہیں اور یہ چیز انسانی صحت کے لیے ایک مستقل مسئلہ اور خطرہ ہے۔

تھر کے علاقے میں خشک سالی، اور اس کے نتیجے میں رُونما ہونے والی خوراک کی عدم فراہمی اور غذائی قلت بچوں اور خواتین میں بیماریوں کا بڑا سبب ہیں جو قحط اور غذا کی کمیابی کی مختلف کیفیات (intensities) کے ساتھ ایک معمول بن گئی ہیں۔ علاج کی سہولتیں ناپید ہیں۔ گذشتہ ۲۰ سال میں نو بار خشک سالی اور غذا کی قلت وبا کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور انسانوں اور مویشیوں کی

قابلِ ذکر پیمانے پر ہلاکت کا باعث رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ علاقہ ایک مخدوش علاقہ ہے اور خشک سالی اور غذا کی قلت ایک معلوم مسئلہ ہے، جس کے حل کے لیے مناسب منصوبہ بندی اور غذا، صحت، تعلیم اور روزگار کی فراہمی کا ایسا نظام ضروری ہے جو ہر دو تین سال کے بعد خشک سالی سے پیدا ہونے والے مسائل کے مستقل حل کا ذریعہ ہو۔ اچھی حکمرانی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ملک کے مختلف علاقوں کے حالات اور موسم اور دوسرے قدرتی عوامل کے اُتار چڑھاؤ کی تاریخ اور صورتِ حال کی روشنی میں اصلاح احوال کا مستقل بنیادوں پر اہتمام کیا جائے۔ تھر کا صحرا دنیا کے ان چند صحراؤں میں سے ہے جنھیں زرخیز صحرا کہا جاتا ہے، یعنی پانی کی فراہمی کے مناسب انتظام کی صحیح منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کے ذریعے اسے سبزہ زار بنایا جاسکتا ہے اور قدرت کے تھپیڑوں کا بڑی حد تک کامیابی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

اس پس منظر میں ۷ مارچ ۲۰۱۴ء کو میڈیا پر سوا سو بچوں کے بھوک، کم خوراکی اور بیماریوں سے لقمۂ اجل بن جانے کی خبر نے پاکستان کے عوام کو ہلا کر رکھ دیا اور گذشتہ دو ہفتوں میں جو حقائق قوم کے سامنے آئے ہیں، وہ جہاں نہایت افسوس ناک اور شرم ناک ہیں، وہیں سندھ کی حکومت کی غفلت ہی نہیں مجرمانہ غفلت کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ جناب تصدق حسین جیلانی نے بجا طور پر سوموٹو نوٹس پر سماعت کے دوران تھر کی صورت حال کو پوری قوم کا سر شرم سے جھکا دینے کے مترادف قرار دیا ہے اور اس کی بنیادی ذمہ داری صوبہ سندھ کی حکومت اور اس کی پالیسیوں اور رویوں کو قرار دیا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ تھرپارکر کے حالات اور تاریخی اعداد و شمار کوئی نئی شے نہیں۔ اقوامِ متحدہ کی فوڈ اینڈ ایگری کلچرل آرگنائزیشن (FAO) نے پانچ سال پہلے متنبہ کیا تھا کہ آنے والے برسوں میں اس علاقے میں خوراک کی قلت اور فاقہ کشی کے شدید خطرات ہیں، اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طور پر مناسب اقدامات کی ضرورت ہے جس کی طرف حکومت کو توجہ دینی چاہیے اور صحیح پالیسیاں وضع کر کے انھیں رُوبہ عمل لانا چاہیے ___ لیکن مقامی انتظامیہ اور صوبائی حکومت غافل رہے۔

ستم یہ ہے کہ خود صوبائی حکومت نے ۲۰۱۲ء میں تھرپارکر کے پورے علاقے کو بڑی تباہی

کا خطہ قرار دیا تھا اور ایک قانون کا مسودہ صوبائی حکومت نے Draft-Nutritional Policy کے عنوان سے تیار کیا تھا لیکن دوسال میں وہ ڈرافٹ صرف ڈرافٹ ہی رہا، جسے نہ حکومت کی پالیسی کی صورت اختیار کرنا نصیب ہوا اور نہ اس کی تنفیذ سے خوراک اور پانی کی فراہمی کے لیے کوئی قانون سازی ہوئی۔ خطرات منڈلاتے رہے۔ اربابِ حکومت اپنی حکمرانی کی دُھن میں مَست بانسری بجاتے رہے اور ان کی دل چسپی عوام کی مشکلات کو دُور کرنے کے لیے ضروری اقدامات کی جگہ فیسٹیول منانے اور اپنے حلوے مانڈے تک محدود رہی۔

پھر اگست ۲۰۱۳ء میں محکمہ موسمیات نے وارننگ دے دی تھی کہ ۱۵/اگست تک بارشوں کے نہ ہونے سے انسانوں اور مویشیوں کے لیے خوراک کی قلت کا شدید خطرہ ہے لیکن یہ وارننگ بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور ستمبر ۲۰۱۳ء سے بچوں کی اموات کا سلسلہ شروع ہوگیا جس میں دسمبر ۲۰۱۳ء میں تیزی سے اضافہ ہوا اور فروری ۲۰۱۴ء تک ۱۲۱ بچے زندگی کی بازی ہار گئے۔ ان سطور کی تحریر کے وقت (۲۰/مارچ ۲۰۱۴ء) تک اموات کی وہ تعداد جو رپورٹ ہوئی ہے ۱۷۲ تک پہنچ چکی ہے اور خدشہ ہے کہ ایک خاصی بڑی تعداد ان بچوں کی بھی ہے جو ہسپتالوں تک نہیں لائے جاسکے اور جو اپنے اپنے دیہات یا صحرا کی ریت ہی پر دم توڑ گئے۔ اس طرح سیکڑوں کی تعداد میں انسانی غنچے بن کھلے ہی مرجھا گئے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ۲۰۱۱ء میں پاکستان کے تمام علاقوں کے بارے میں غذائی اجناس کی فراہمی کے باب میں ایک اہم سروے ہوا تھا جسے Pakistan Nutritional Survey 2011 کہا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے ملک کی آبادی کا ۵۷ فی صد غذائی عدم تحفظ (food insecurity) کا شکار ہے اور سب سے خراب صورت حال فاٹا کے ساتھ ساتھ سندھ اور خصوصیت سے تھرپارکر کے علاقے میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح صحت اور تعلیم کے حالات کے تمام جائزوں کے ذریعے یہ بات سامنے آئی تھی کہ یہ علاقہ معرضِ خطر میں ہے اور فوری اور مستقل ہر دو بنیادوں پر مؤثر منصوبہ بندی اور عملی اقدام کی ضرورت ہے، مگر صوبے کی انتظامیہ اور سیاسی قیادت اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں بُری طرح ناکام رہی۔

حکومت اور انتظامیہ کی ناکامی اور بے حسی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریلیف اور

صحت کے شعبے کا کوئی وزیر ہی موجود نہیں ہے۔ جن صاحب کو عارضی چارج دیا گیا ہے، انھوں نے کبھی اس علاقے کے حالات کو جاننے اور سنوارنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ انتظامی عہدوں پر نااہل اقربا کا تقرر کیا گیا جنھیں علاقے کی فلاح و بہبود سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ سپریم کورٹ میں صوبے کے سیکرٹری صحت نے اپنے بیان میں ہسپتالوں اور صحت مراکز پر ڈاکٹروں کی غیرحاضری کا جو نقشہ کھینچا ہے اس پر انسان صرف سر ہی پھوڑ سکتا ہے۔ ارشاد ہے کہ صرف اس علاقے کے جہاں صحت اور ادویہ کی عدم فراہمی کی وجہ سے سیکڑوں بچے موت کی آغوش میں جا بسے ہیں، ۴۵۰ ڈاکٹر ڈیوٹی سے غائب تھے اور اب انھیں شوکاز نوٹس دیے گئے ہیں۔

صوبائی حکومت کی بے بصیرتی، غیرسنجیدگی اور بدترین نوعیت کی حکمرانی اس صورت حال کا اولین سبب ہے۔ دوم: انتظامیہ کی نااہلی، کرپشن اور احتساب اور نگرانی کے نظام کا فقدان۔ سوم: اس علاقے میں معاشی اور سماجی انفرااسٹرکچر کا فقدان اور منصوبہ بندی کا افلاس ہے۔ سڑکیں بنادی گئی ہیں مگر ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔ ہسپتال موجود ہیں مگر ڈاکٹر اور ادویات ندارد۔ گندم کی بوریاں گوداموں میں سڑ رہی ہیں اور لوگ روٹی کے دو لقموں کو ترس رہے ہیں۔ پانی کی ترسیل کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہے۔ ان پر مستزاد عملے کی نااہلی اور کرپشن ـــــ قوم نے اپنا پیٹ کاٹ کر جو وسائل اس علاقے کے لیے فراہم کیے اس کا بمشکل ۱۰ فی صد عوام تک پہنچتا ہے اور ۹۰ فی صد کرپٹ عناصر کی ہوس زرگری کی نذر ہو جاتا ہے اور اُوپر سے نیچے تک احتساب کا کوئی نظام ہی موجود نہیں ہے۔

اس سب کچھ پر بے حسی کا یہ عالم ہے کہ حکومت کی بڑی ذمہ دار ہستی جسے خصوصیّت سے حالات کو سدھارنے کے لیے کراچی سے تھر بھیجا گیا ہے، ان کا ارشاد ہے کہ یہ سارا فاقہ وفساد میڈیا کا کیا دھرا ہے۔ بڑی شانِ بے نیازی کے ساتھ اس کے لیے ایک نئی اصطلاح وضع فرماتے ہیں کہ یہ MMD ہے یعنی Media Made Disaster۔ خود وزیراعلیٰ صاحب فرماتے ہیں: This is a normal occurence in the Thar district. (ضلع تھر میں یہ ایک معمول کا واقعہ یا صورتِ حال ہے) ـــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ الیہ رٰجعون! یعنی یہاں پہلے بھی لوگ مرتے رہتے ہیں اور اب بھی مر رہے ہیں۔

یہ وہ حکمران فرما رہے ہیں جو ’’روٹی، کپڑا اور مکان‘‘ کے نعرے پر اقتدار میں آئے تھے اور

غریب عوام کے مسائل کو حل کرنے کے سب سے بڑے دعوے دار تھے۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے پالیسی سازی کا بحران، بدترین حکمرانی اور کرپشن کے ساتھ اربابِ اقتدار کی بے حسی اور غیرسنجیدگی نے بھی حالات کو بگاڑنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اصل مسئلہ خوراک کی عدم فراہمی نہیں، بدترین طرزِ حکمرانی ہے۔ ریلیف کی فوری کوششوں کے ساتھ واضح پالیسی کی تشکیل اور انتظامی مشینری اور خدمات کی فراہمی، خصوصیّت سے پہنچانے کے نظام کی اصلاح ازبس ضروری ہے۔ محض فنڈز کی فراہمی سے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ حکومت کی مشینری کی نااہلی اور ناکامی کے ساتھ اگر ایک نظر غیرحکومتی خدمتی اداروں کی کارکردگی پر ڈالی جائے تو فرق صاف نظر آتا ہے۔ الخدمت فاؤنڈیشن اپنے محدود وسائل کے ساتھ ۱۹۹۸ء سے اس علاقے میں پانی کی فراہمی، تعلیم اور ادویات کی فراہمی کے لیے ایک جامع منصوبے کے تحت کام کررہی ہے۔ اس عرصے میں ۵۰۰ سے زیادہ کنویں کھودے گئے ہیں، جسے زم زم پراجیکٹ کا عنوان دیا گیا ہے اور ہزاروں افراد کو پینے کا صاف پانی میسر آیا ہے۔ حالیہ بحران کے موقعے پر بھی الخدمت فاؤنڈیشن مؤثر خدمات انجام دے رہی ہے۔ اسی طرح جماعت الدعوۃ، پیار ریلیف، ایدھی فاؤنڈیشن اور خودفوج کے دستوں نے بڑی مفید خدمات انجام دی ہیں۔

اگر یہ ادارے انسانی جانوں کو بچانے اور بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اتنا کچھ کرسکتے ہیں، تو پھر حکومت کیوں اپنے اربوں روپے کے ترقیاتی پروگراموں اور ہزاروں افسروں اور کارندوں کے لاؤلشکر کے باوجود کوئی مؤثر خدمت انجام نہیں دے سکی؟___ وقت آگیا ہے کہ جن کے ہاتھوں میں حکومت کی زمامِ کار ہے اور جو قوم کے وسائل کے استعمال پر مامور ہیں، ان کا پورا پورا احتساب کیا جائے اور قوم کے وسائل قوم کی بہبود کے لیے استعمال کیے جانے کا اہتمام کیا جائے۔

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! مجھے کسی ایسے عمل کی رہنمائی فرمائیے جس پر عمل کر کے ایک بندہ سیدھا جنت میں داخل ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ پر ایمان لے آئے۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! ایمان کے ساتھ کوئی عمل بھی بتلا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسے جو رزق دیا ہے اس میں سے کچھ دوسروں کو بھی دیا کرے۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اگر وہ فقیر ہو، اس کے پاس کچھ نہ ہو، تو آپؐ نے فرمایا: اپنی زبان سے بھلی بات کہے۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اگر وہ زبان کے ذریعے مافی الضمیر ادا کرنے سے عاجز ہو تو پھر کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ بے بس آدمی کی اعانت کرے۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اگر وہ ضعیف ہو، قدرت نہ رکھتا ہو، تو آپؐ نے فرمایا: اس کے لیے کام کرے جو کام کو نہیں جانتا۔ میں نے عرض کیا: اگر وہ خود بھی کوئی کام نہ جانتا ہو، تو اس پر آپؐ نے فرمایا: تم کیا چاہتے ہو؟ تم یہ چاہتے ہو کہ تمھارے دوست کے پاس کسی قسم کی بھلائی نہ ہو، اس کے پاس مذکورہ چیزیں نہ ہوں، تو کم از کم وہ لوگوں کو کوئی تکلیف نہ دے۔ میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! یہ سارے کام تو آسان ہیں (یعنی جس آدمی کے پاس ان کاموں کو کرنے کی قدرت ہے اس کے لیے تو یہ کام معمولی ہیں، بالکل آسان ہیں)۔ پھر ان تھوڑے سے کاموں کی بنا پر وہ جنت میں چلا جائے گا؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، جو آدمی بھی ان خصلتوں میں سے کسی ایک خصلت کو اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کی نیت سے کرے گا، مَیں قیامت کے روز اسے اپنے ہاتھ سے پکڑ کر سیدھا جنت میں داخل کروں گا۔ (ابن حبان)

ایک مومن کا پہلا کام تو اپنے ایمان کو زندہ اور قوی کرنا ہے۔ ایمان قوی ہوگا تو پھر اس کے لیے سارے کام آسان ہو جائیں گے۔ اگر جسمانی عوارض کی وجہ سے وہ ایسا کام نہ کر سکے جس کے لیے جسمانی قوت کی ضرورت ہے تو کوئی دوسرا کام کرے جس کی قوت رکھتا ہو۔ اگر کوئی مثبت کام اور خدمت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو تو کم از کم اتنا تو کر سکتا ہے کہ لوگوں کو تکلیف نہ دے اور اس کام کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کرنے کی نیت کرے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر یہ چھوٹا کام بھی چھوٹا نہ رہے گا بڑا شمار ہوگا، جس نے ساری زندگی اس صفت کو اپنائے رکھا وہ نیکیوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرلے گا۔ اللہ تعالیٰ کے نبیؐ کا وہ محبوب ہوگا کہ اپنے ایمان کو بھی مضبوط کیا اور خلقِ خدا کو کوئی تکلیف بھی نہ دی۔ کمالِ ایمان کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کی نعمت سے بھی سرفراز ہوا اور خلقِ خدا کی خیر خواہی اور اس کو اذیت سے بچانے کے سبب بھی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا۔ پھر جو آدمی خود خلقِ خدا کو اذیت سے بچاتا ہے وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ اسے اس کی اس نیت کا ثواب بھی ملتا ہے۔ تب وہ جنت کا ہر پہلو سے مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث ایک طرف اللہ تعالیٰ کے بے پناہ فضل و کرم کا نمونہ پیش کرتی ہے اور دوسری طرف بندوں کو بندگی کا حوصلہ اور ہمت بھی دیتی ہے کہ وہ جس حال میں بھی ہوں اللہ تعالیٰ کی بندگی کی کسی نہ کسی صورت کو عملی جامہ پہنا کر جنت میں جاسکتے ہیں اور دنیا میں معاشرے کے لیے باعث خیر و برکت کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں۔

○

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے کسی گناہ کا واویلا کرتا ہوا حاضر ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا: ہائے میرا گناہ، ہائے میرا گناہ! دو مرتبہ یا تین مرتبہ یہ کلمات کہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: اس طرح سے کہو: اَللّٰھُمَّ مَغْفِرَتُكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِی وَرَحْمَتُكَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِی ''اے اللہ! تیری بخشش میرے گناہوں سے زیادہ کشادہ ہے اور تیری رحمت سے مجھے اپنے عمل کے مقابلے میں زیادہ اُمید ہے''۔ اس نے ایک مرتبہ یہ کلمات کہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوبارہ کہو۔ اس نے دوبارہ کہے تو آپؐ نے فرمایا: پھر کہو تو اس نے تیسری بار بھی یہ کلمات کہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ اور چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے معاف کر دیا ہے۔ (مستدرک حاکم)

بندہ صدقِ دل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرما لیتے ہیں۔ ایک مومن گناہ کر کے اس پر قائم نہیں

رہتا بلکہ فوراً توبہ کرتا ہے۔ توبہ کرنا مومن کی صفت ہے۔ اس لیے گناہ کے بعد مومن کو پریشانی لاحق ہونی چاہیے۔ وہ ذات جس کی نعمتوں میں انسان گھرا ہوا ہے، اس کی نافرمانی کوئی معمولی جرم نہیں ہے بلکہ ایمان کو ضعف پہنچانے والی بیماری ہے۔ بیماری کو آغاز میں روکنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اگر غفلت برتی جائے اور بیماری کا علاج نہ کیا گیا تو بڑھتے بڑھتے وہ کینسر کی شکل بھی اختیار کرسکتی ہے اور پھر لاعلاج ہوکر موت سے ہم کنار کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ یہی حال گناہ کا بھی ہے۔ گناہ کا بھی تدارک نہ کیا جائے تو وہ بڑھتے بڑھتے آدمی کے لیے روحانی موت کا باعث بن جاتا ہے۔ دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ آنکھ، کان پر پردے پڑ جاتے ہیں، دماغ صحیح اور غلط میں تمیز کرنے سے عاجز ہوجاتا ہے۔ اس وقت کے آنے سے پہلے گناہ کے وبال سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اپنے کیے پر نادم ہونا اور آیندہ کے لیے گناہ کے ارتکاب سے دامن کو بچانا اور سابقہ گناہوں سے مسلسل استغفار کرتے رہنا گناہ کے اثر کو مٹا دیتا ہے۔

○

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَیں اپنی مرضی سے نہ تمھیں دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں۔ میں تو تقسیم کرنے والا ہوں۔ مَیں وہاں دیتا ہوں جہاں مجھے دینے کا حکم دیا گیا ہو۔ (بخاری)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے نبی اور رسولؐ ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ صاحبِ اختیار حاکم بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے خزانے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خزانوں کی تقسیم میں اپنی مرضی نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق انھیں تقسیم کیا۔ یوں مسلمان حکمرانوں کے لیے ایک عظیم الشان قابلِ تقلید نمونہ پیش فرمایا کہ جب میں اللہ تعالیٰ کا نبی اور رسول اور معصوم عن الخطا ہوکر حق داروں کو ان کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہوں، تو کسی دوسرے کے لیے اس بات کی کیا گنجایش رہ جاتی ہے کہ وہ اللہ کے مال میں خیانت کرے، حق داروں کی حق تلفی کرے اور اپنے خاندانوں کو نوازے۔

○

حضرت سلمانؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یقیناً تمھارا رب شرمانے والی اور کرم کرنے والی ذات ہے۔ وہ اس بات سے شرماتا ہے کہ بندہ اس سے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگے اور وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ بے نیاز ذات ہے اسے بندوں سے کسی بھی قسم کی کوئی حاجت نہیں ہے بلکہ وہ بندوں کی حاجات پوری کرنے والا ہے۔اس نے بن مانگے بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ پھر وہ مانگنے پر خوش ہوتا ہے اور عطا بھی فرماتا ہے۔ بندہ جب اخلاص سے بیدار دل کے ساتھ اس سے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگے تو وہ ضرور عنایت فرماتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ بے نیاز اور بے غرض ہونے کے باوجود بندوں سے شرم کرتا ہے تو بندوں کو بدرجۂ اولیٰ اللہ تعالیٰ سے شرم کرنی چاہیے اور اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی سے بچنا چاہیے۔ حدیث میں حیا کو ایمان کے عظیم الشان شعبوں میں سے ایک بڑا شعبہ قرار دیا گیا ہے۔ آج ہم پر فرض ہے کہ اپنے معاشرے کو 'حیا' کی زینت سے مزین کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے تیار کریں۔ معاشرے سے بے حیائی کی تمام شکلوں کا خاتمہ کردیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے 'حیا' کرنے کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا جائے، دعوت و تبلیغ کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا جائے۔

○

حضرت ابی مالک اشعریؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں ایسے بالاخانے ہیں جن کے باہر سے اندر اور اندر سے باہر نظر آتا ہے (موتیوں کے بنے ہوئے شیش محل کے بالاخانے ہیں)۔ یہ بالاخانے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے تیار کیے ہیں جو نرم گفتگو کریں۔ لوگوں کو کھانا کھلائیں اور مسلسل روزے رکھیں اور راتوں کو نمازیں پڑھیں، جب کہ دوسرے لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

نرم گفتگو آدمی کو اللہ تعالیٰ کے قریب اور خلقِ خدا کے لیے پُرکشش بناتی ہے۔ یہ حُسنِ اخلاق کی وہ صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شان کا اپنے کلام پاک میں ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے: فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ وَ لَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ (آلِ عمرٰن ۳:۱۵۹)'' (اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے''۔ اسی طرح مہمان نوازی اور روزے رکھنا اور راتوں کو اُٹھ کر تہجد پڑھنا، اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندوں کے اخلاقِ حسنہ کا حصہ ہیں، خصوصاً انبیاے علیہم السلام۔ چنانچہ انبیاے علیہم السلام کے پیروکار اہلِ ایمان جنھوں نے نیکی اور تقویٰ میں مقام پیدا کیا، انھوں نے ان تمام صفات کو اپنایا۔ بخل اور تقویٰ کا آپس میں تضاد ہے۔

اولاد کی تربیت محبت سے

ڈاکٹر سمیر یونس/ ترجمہ: محمد ظہیرالدین بھٹی

ایک عمر رسیدہ مردِ دانا، دریا کے کنارے بیٹھا، کائنات میں اللہ تعالیٰ کی حسین و جمیل کاری گری سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک بچھو پر پڑی، جو پانی میں گر پڑا تھا اور ڈوبنے ہی والا تھا۔ بچھو اپنے آپ کو پانی کے سپرد کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پانی کی جس لہر میں وہ گرا تھا وہ بہت تند و تیز تھی۔ بچھو نے ہرچند کوشش کی مگر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ ڈوبنے ہی والا تھا۔ عمر رسیدہ دانا بزرگ نے بچھو کی یہ کربناک حالت دیکھی تو اسے بچانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنا ہاتھ بچھو کی طرف بڑھایا تو بچھو نے اسے ڈس لیا۔ درد کی شدت سے بے تاب ہوکر مردِ دانا نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا، مگر اس نے جونہی بچھو کی طرف دیکھا کہ وہ ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے تو اسے ترس آ گیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ بچھو کی طرف بڑھایا تاکہ اسے مرنے سے بچالے، مگر بچھو نے اسے دوبارہ ڈس لیا۔ اس نے درد سے بے چین ہوکر چیخ ماری اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس نے اب جو بچھو کو دیکھا تو یقین ہوگیا کہ وہ موت کے کنارے پہنچ چکا ہے، چنانچہ اسے بچانے کے لیے تیسری بار اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مردِ دانا کے قریب بیٹھا ایک نوجوان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ چلّا کر بولا: اے مردِ بزرگ! کیا آپ نے دوبار ڈسے جانے سے بھی سبق نہیں سیکھا کہ اب تیسری بار ہاتھ بڑھا رہے ہیں؟

مردِ دانا نے اس نوجوان کی ملامت کی بالکل پروا نہ کی اور بچھو کو بچانے کی برابر کوشش کرتا رہا، بالآخر اسے ڈوبنے سے بچا ہی لیا۔ اب وہ ملامت کرنے والے نوجوان کی طرف متوجہ ہوا، شفقت و محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا: بیٹے، بچھو کی فطرت

میں ڈنگ مارنا اور ڈسنا ہے، جب کہ میری فطرت میں محبت و شفقت کرنا ہے۔

مبارک تھا وہ سلیم الفطرت مرد بزرگ، جس کا دل محبت سے بھرپور تھا۔ مبارک ہے وہ انسان جو شیطان کی کشش کو ردّ کردیتا ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جو اپنے آپ پر ضبط رکھتا ہے۔ آپ نے یہ مقولہ سنا یا پڑھا ہوگا: درختوں کی مانند ہوجاؤ کہ لوگ ان پر پتھر پھینکتے ہیں اور وہ ان کی طرف پھل پھینکتے ہیں۔ کیا آپ نے درختوں پر انسانوں کے پتھر مارنے پر کبھی غور کیا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ پتھر پھینکنے والا، ہمیشہ اُس سے ادنیٰ، پست اور نیچے ہوتا ہے جس پر پتھر پھینکتا ہے۔ کیا آپ نے ملاحظہ کیا کہ بلند و بالا کھجور کے درخت پر پتھر پھینکنے والا انسان اُس سے بہت نیچے ہوتا ہے اور وہ اپنے سے اُونچے درخت پر سنگ باری کرتا ہے؟ اسی طرح چھوٹے بڑوں پر پتھر پھینکا کرتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ لوگوں کا رویہ اور برتاؤ آپ کو پریشان کردے مگر آپ ہرگز اپنے حسنِ سلوک سے دست کش نہ ہوں۔ آپ لوگوں کے رویے کے ردعمل میں اپنی عمدہ صفات ترک نہ کریں، اور اپنے اخلاقِ حمیدہ نہ چھوڑیں۔ آپ ہرگز ان باتوں پر کان نہ دھریں کہ لوگوں کے رویوں کے مطابق ہی ان سے پیش آنا چاہیے، کیوں کہ یہ لوگ کسی شریفانہ سلوک کے مستحق نہیں ہیں۔

اگر آپ نے یہ اصول تسلیم کرلیا ہے اور اس کے برحق ہونے کے قائل ہوگئے ہیں کہ انسان کو دوسروں کے سلوک سے قطعِ نظر ہمیشہ حُسنِ سلوک پر کاربند رہنا چاہیے، تو پھر آپ سے درخواست ہے کہ آپ کے حُسنِ سلوک کے سب سے زیادہ حق دار آپ کے گھر والے، یعنی اہل و عیال ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے: ''تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے لیے بہتر ہے، اور میں اپنے اہلِ خانہ کے لیے تم سب سے بہتر ہوں''۔

بہت سے والدین کو اپنی اولاد کے طرزِ عمل سے سخت اذیت پہنچتی ہے، کیوں کہ بچے ماں باپ کی نافرمانی کرتے ہیں، اور اپنی تعلیم کو نظرانداز کردیتے ہیں۔ وہ والدین کے لیے پریشانی کا سبب بنتے ہیں اور ان کا جینا دوبھر کردیتے ہیں۔ اس مرحلے پر والدین کا پیمانۂ صبر لبریز ہوجاتا ہے اور وہ اولاد سے سختی کرتے ہیں۔ شیکسپیئر کا قول ہے: ''محبت کرو اس سے پہلے کہ تم سے نفرت کی جائے''۔

بہت سے والدین کے نزدیک اولاد کی تربیت میں سختی و شدت ناگزیر ہے۔ وہ سزا اور سختی کے سوا کسی عمل کو مفید نہیں سمجھتے۔ ان کی نظر میں تربیت کے تمام طریقے غیرمؤثر اور سمجھانے کے تمام

ذرائع بے کار اور غیر مفید ہیں۔ اپنے اس طریق کار کے درست ہونے کی، ان کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ انھوں نے خود اسی نہج پر پرورش پائی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے باپوں میں سے ایک 'باپ' نے مجھے بتایا: ''میں اپنے باپ کے سامنے چپ چاپ کھڑا رہتا تھا۔ نہ تو میں اس سے بات کرتا تھا اور نہ اس کی قطع کلامی کی ہی جسارت کرتا تھا۔ وہ جب بھی بات کر رہا ہوتا تو مجھے جواب دینے یا کچھ بولنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ کیوں کہ باپ کی بات کا جواب دینا، بیٹے کی طرف سے باپ کی شان میں گستاخی تصور کیا جاتا تھا اور اسے بے ادبی پر محمول کیا جاتا تھا۔ والد صاحب اپنی آواز بہت اُونچی کرلیتے تھے، جب کہ میں چپ سادھے رہتا تھا۔ مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت میری پٹائی کرسکتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ مجھے کب پیٹیں گے اور کیسے زدوکوب کریں گے؟ وہ اپنے خطاب کے دوران یک دم میرے چہرے پر دائیں بائیں سے تابڑ توڑ تھپڑ رسید کرتے تھے۔ میرے لیے حکم یہ ہوتا تھا کہ تھپڑوں کی اس بارش کے دوران خاموش کھڑا رہوں اور بالکل حرکت نہ کروں۔ میرے والدین نے میری تربیت اس طرح کی ہے اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ــــــ میں مرد بن چکا ہوں''۔

میں نے اس باپ سے پوچھا: کیا آپ بھی اپنی اولاد کے ساتھ یہی وتیرہ اپنائے ہوئے ہیں؟ تو اس کا جواب تھا: یقیناً، مجھے امید ہے کہ میری اولاد ضرور سیدھے راستے پر چلے گی۔ میں نے کہا: ذرا مجھے یہ بتایئے کہ جب آپ بیٹے سے بات کر رہے ہوتے ہیں تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟ اس نے کہا: وہ میرے سامنے کھڑا کانپتا رہتا ہے، خاموشی سے میری باتیں سنتا ہے اور بالکل جواب نہیں دیتا۔

اس قماش کے باپ کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے بچوں کی درست نہج پر تربیت کرسکے۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو چپ کرا دے اور اسے ماتحت و فرماں بردار رہنے پر مجبُور کردے مگر ایسا باپ اپنی اولاد میں بزدلی، بے بسی، بے ہمتی، عاجزی اور ذلت و خواری کے بیج بو دیتا ہے۔ وہ معاشرے کو نفسیاتی لحاظ سے ایک شکست خوردہ، مغلوب و مضطرب شخصیت پیش کرتا ہے۔ ایسا باپ ایک متوازن اور طاقت ور شخصیت کی تعمیر و تشکیل سے قاصر رہتا ہے۔ وہ ایسی شخصیت کبھی پیش نہیں کرسکتا جو اپنے آپ کو نفع پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور دیگر افرادِ معاشرہ کے لیے

بھی مفید ثابت ہو، اور یوں خاندان کی عمارت کی تعمیر کے لیے ایک مضبوط اینٹ کا کام کرے۔ اپنے سماج اور اپنی قوم وملّت کے لیے مفید شخصیت تیار کرنا ایسے باپ کے بس کا روگ نہیں۔

● **محبت سے تربیت کی اہمیت اور ذرائع**: محبت سے اولاد کی تربیت کرنا انتہائی ضروری ہے، تاکہ ہم موافقت وہم آہنگی اور یکسانیت وتال میل سے بھرپور زندگی گزار سکیں۔ یوں ہم اپنے پروردگار کو بھی راضی کر سکنے کے قابل ہوجائیں گے اور ہم اور ہماری اولاد دنیا وآخرت میں سرخ رو اور کام یاب ہوجائیں گے۔ ہم ایک ایسا معاشرہ وجود میں لاسکیں گے جو توانا ومضبوط ہو، باہم مجتمع وہم آہنگ ہو اور جس کا ہر فرد دوسروں سے محبت واُلفت کرنے والا ہو۔ سوال یہ ہے کہ محبت کے ذریعے اولاد کی تربیت کے طریقے کیا ہیں؟

یوں تو ماہرین نفسیات وعمرانیات اور ماہرین تربیت نے محبت کے ذریعے اولاد کی تربیت کے متعدد ذرائع اور طریقے بیان کیے ہیں مگر ان میں سے اہم ترین طریقے درج ذیل ہیں:

● **کلامِ محبت**: انسانوں کی تربیت، ان کی راہ نمائی کے لیے دلوں میں اُلفت پیدا کرنے، اور ان کے اُمور ومعاملات اور نفوس کی اصلاح کے لیے کلام، یعنی بات چیت اور گفتگو انتہائی مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ کلام دراصل اس گھنے سایہ دار درخت کی مانند ہے جو پتوں اور پھلوں سے لدا ہو اور بے شمار منافع وفوائد رکھتا ہو۔ اللہ سبحانہٗ نے کلام کو ایک درخت سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ فرمایا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (ابراہیم ۱۴:۲۴-۲۵) ’’کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ (پاکیزہ کلام) کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں‘‘۔

ایک تحقیقی مطالعے سے ثابت ہوا ہے کہ ایک فرد ہوش سنبھالنے سے لے کر کامل بلوغ تک ۱۶ ہزار منفی (بُرے) الفاظ سنتا ہے، جب کہ وہ اس مدت میں مثبت (اچھے) الفاظ صرف چند سو ہی سنتا ہے۔ ہم لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ سلبی ومنفی، یعنی بُرے الفاظ وکلمات ہمارے بچوں کی

تربیت پر کتنے بُرے اثرات مترتب کرتے ہیں۔

ماہرین تربیت اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب ماں باپ یا تربیت کرنے والوں کی طرف سے بچے کی توہین کی جاتی ہے اور اسے بُرے بُرے القاب وصفات سے پکارا جاتا ہے تو بچہ اپنی ذات کے بارے میں، اپنے ذہن میں ایک تصویر یا خاکہ بنالیتا ہے۔ گویا اپنی ذات کے بارے میں یہ ذہنی تصویر، اس کلام کا نتیجہ ہوتا ہے، جو وہ اپنے بارے میں لوگوں کی زبانوں سے سنتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ بچے کے بارے میں دوسروں کی باتیں نقاش (مصور) کا برش ہیں۔ نقاش بچے کے بارے میں باتیں کرنے والا ہے۔ اگر بچے کے بارے میں اور بچے سے بات کرنے والا شخص کالے رنگ کا بُرش استعمال کرتا ہے تو سیاہ تصویر وجود میں آتی ہے اور اگر وہ خوب صورت رنگ استعمال کرتا ہے تو تصویر بھی حسین ہوگی۔

کچھ باپ جب اپنے بیٹوں سے بات کرتے ہیں تو اپنی گفتگو سے ان کی شخصیتوں کو مسخ کردیتے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنے بیٹے کی قدر و قیمت کم نہ کیجیے۔ ایک ماں کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ بات کرتے وقت اس کی شخصیت کو کچل دے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں سے باتیں کرتے وقت توہین آمیز لفظوں، تحقیر آمیز باتوں، طعن و تشنیع، تمسخر و استہزا اور گالم گلوچ سے مکمل اجتناب کریں۔ وہ کسی بھی صورت میں منفی الفاظ وکلمات استعمال نہ کریں۔ کیوں کہ بچوں کے ساتھ منفی رویہ اختیار کرنے سے، اس کے انتہائی تلخ نتائج سامنے آیا کرتے ہیں۔ چنانچہ بچوں میں علیحدگی پسندی، کم آمیزی، جارحیت، مختلف طرح کے خوف، عدمِ خوداعتمادی، تحقیر ذات، نفسیاتی امراض اور طرح طرح کے بگاڑ جنم لیتے ہیں۔

● **نگاہِ محبت**: کتبِ سیرت واحادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھنے والا ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ وہ دیگر تمام حاضرین کے مقابلے میں حضورؐ کا سب سے زیادہ محبوب ہے۔ کیونکہ رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص کو محبت بھری نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکیے، اس کے سامنے مسکرائیے، محبت بھری نگاہ کے ساتھ ساتھ محبت آمیز بات چیت کیجیے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا یہ مشورہ پڑھ کر قارئین کرام میں سے کوئی سخت گیر باپ یہ کہے: میں یہ کیسے کروں؟ اس لیے کہ میں نے تو اپنے بیٹے کو اس کا عادی نہیں بنایا اور اگر میں

اپنے بیٹے کو پیار بھری نظر سے دیکھ بھی لوں تو وہ ضرور حیران ہوگا۔ اب میں اس کی حیرت کا جواب کیا دوں؟ میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنے بیٹے کے والدِ محترم ہیں، آپ ایک شفیق باپ ہیں۔ خدارا! اپنے بیٹے پر دھاوا بولنے اور حملہ کرنے کے انداز کو ترک کر دیجیے اور اس سے مسکرا کر بات کیجیے۔ اگر بیٹا، آپ سے اس اچانک تبدیلی کا راز پوچھے تو آپ اسے یوں جواب دیجیے: ''بیٹا، میں آپ سے محبت کرتا ہوں''، یا ''میرے لختِ جگر مجھے تمھارا ہمیشہ خیال رہتا ہے''۔

● **محبت آمیز لمس:** یہ خلافِ حکمت ہے کہ آپ اپنے بیٹے سے برتر واعلیٰ ہو کر بات کریں، برتری خواہ جگہ اور مقام کے اعتبار سے ہو یا گفتگو کے لحاظ سے۔ آپ اپنے بیٹے سے اس طرح بات نہ کریں کہ آپ تو ایک اُونچی کرسی پر براجمان ہوں اور وہ نیچے بیٹھا ہو، اور نہ اس اسلوب و انداز میں ہی بات کریں کہ گویا آپ ایک فوجی کمانڈر ہیں اور بیٹا آپ کا ایک ماتحت سپاہی اور آپ اسے احکام دے رہے ہیں اور وہ 'جی جناب، جی جناب' کہہ رہا ہے۔ یہ بھی حکمت کا تقاضا نہیں کہ آپ دُور سے ہی بیٹے سے مخاطب ہوں، بلکہ آپ کو چاہیے کہ آپ ہر لحاظ سے بیٹے کے نزدیک ہوں، دل سے بھی نزدیک، مجلس کے لحاظ سے بھی قریب اور بات چیت کے انداز سے بھی۔

آپ جب بھی اپنے بیٹے یا بیٹی سے بات کریں تو پہلے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھیں۔ آپ کی آواز میں محبت ہونی چاہیے۔ آپ کے لمس میں شدت و سختی نہیں بلکہ نرمی و محبت ہونی چاہیے، اور اس لمس میں شفقتِ پدری ہو۔ اس سے آپ کی اولاد کو پیغامِ امن و امان ملے۔ پدرانہ محبت کی لہر اولاد کے دلوں تک سرایت کر جائے اور انھیں اس بات کا احساس ہو کہ وہ آپ کے وجود کا حصہ اور جز ہیں۔ آپ جب گھر سے باہر جانے لگیں تو بچوں سے ضرور مصافحہ کیجیے، یا جب آپ کے بچے گھر سے باہر نکلنے لگیں تو بھی آپ ان سے ہاتھ ملایئے اور اپنی دعاؤں کے ساتھ انھیں رخصت کیجیے اور ان کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھیے۔

اب ذرا سا رُک کر، اپنا جائزہ لیجیے کہ آپ ان گزارشات پر کس حد تک عمل کر رہے ہیں؟

● **محبت سے بغل گیر ہونا:** بچوں کی نفسیاتی حاجات و ضروریات میں سے ایک محبت ہے۔ لازم ہے کہ والدین کی جانب سے اس ضرورت و تشنگی کو پورا کیا جائے۔ والدین اگر بچوں سے محبت نہیں کریں گے تو اس کے نتیجے میں بچوں میں محرومی پیدا ہوگی اور محرومی سے بچوں

کے لیے متعدد نفسیاتی روگ اور بگاڑ جنم لیں گے۔ والدین جب اپنے بچوں سے بغل گیر ہوتے ہیں تو اس سے بچوں کو نفسیاتی سکون اور قلبی قرار ملتا ہے، لہٰذا ماں باپ کو اپنی اولاد سے بغل گیر ہونے میں بخل و تردّد سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یقین جانیے کہ بچوں کو والدین سے معانقہ کرنے اور ان کے ساتھ محبت سے لپٹنے کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے، جتنی انھیں کھانے پینے اور سانس لینے کی حاجت ہوتی ہے، بلکہ محبت کی چاہت و حاجت، خوراک کی حاجت سے بھی بڑھ کر ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اس فطری حاجت کو پورا کریں۔

● **بوسۂ شفقت**: رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنے نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو چوم رہے تھے کہ ایک بدو سردار الاقرع بن حابس آیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ اس کے لیے یہ ایک عجیب بات تھی۔ چنانچہ تعجب سے پوچھا: کیا آپؐ اپنے بچوں کو چومتے ہیں؟ میرے ۱۰ بچے ہیں، اللہ کی قسم! میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی کبھی نہیں چوما۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: ''اللہ نے اگر تمھارے دل سے اپنی رحمت سلب کرلی ہو تو مَیں کیا کرسکتا ہوں؟''

والدین جب بچے کو چومتے ہیں تو اس سے بچے کے قلب و نفس پر رحمت و شفقت چھا جاتی ہے۔ اسے امن و امان کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ ہم بچوں کو بوسہ دے کر ہی انھیں اپنی محبت و شفقت کے احساس سے سرشار کرسکتے ہیں۔ اگر ہم بچوں کو محبت و شفقت کے بوسے سے محروم کریں گے تو وہ ہم سے دُور ہٹیں گے۔ نفرت و بےزاری اور سنگ دلی و سختی ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگی۔ وہ بچپن سے ہی دُوری اور کم آمیزی میں مبتلا ہوجائیں گے۔ والدین کے بوسۂ شفقت سے ہی بچوں کے درد و الم دُور ہوتے ہیں۔ ان کے نفسیاتی زخم مندمل ہوتے ہیں اور ذہنی روگ ختم ہوتے ہیں۔ ہم محبت آمیز بوسے سے اپنے بچوں اور بچیوں کو خوشی و مسرت سے ہم کنار کرسکتے ہیں اور انھیں محبت و اُلفت، رضامندی اور شوق و وارفتگی سے معمور کرسکتے ہیں۔

● **محبت بھری مسکراہٹ**: اولاد کے سامنے ہماری مسکراہٹ بے شمار فوائد رکھتی ہے۔ ہمارے اس تبسم سے انھیں مسرت نصیب ہوتی ہے۔ یوں ہمارے اور ان کے مابین ایک خوش گوار رابطہ استوار ہوتا ہے اور باہم محبت بڑھتی ہے۔ اس مسکراہٹ سے خوشیاں ملتی ہیں اور

خامیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ دلوں کے سرچشمے سے مسرتیں پھوٹتی ہیں۔

والدین سے گزارش ہے کہ آپ ذرا آئینے کے سامنے کھڑے ہوجایئے۔ ایک بار مسکرایئے اور پھر آئینے میں دیکھیے۔ ایک بار ترش رُو ہوکر آئینے میں دیکھیے اور پھر دونوں کا فرق ملاحظہ کیجیے۔ یقیناً والدین کی خندہ پیشانی، ان کی مسکراہٹ اور ان کی قربت سے اولاد کو مسرت و فرحت ملتی ہے۔ والدین کے قرب کا حصول، اولاد کی دیرینہ تمنا ہُوا کرتی ہے۔ وہ اس قربت سے اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ یوں ان کے دل ماں باپ کے لیے کھل جاتے ہیں۔ وہ سچّی محبت و یگانگت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ وہ والدین سے سچّی محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ جب بچے ہم سے محبت کرتے ہیں تو پھر وہ ہمیں ترجیح دیتے ہیں اور ہماری فرماں برداری کرتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے گھر میں اہلِ خانہ کے ساتھ، جو طرزِ عمل ہوتا تھا، اس کی عکاسی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یوں کی ہے: ''آپ سب سے بڑھ کر نرم دل، مسکرانے اور ہنسنے والے تھے''۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تمھارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا صدقہ ہے۔ (ترمذی)

والدین کو چاہیے کہ وہ محبت کے ذریعے بچوں کی تربیت کا ضرور تجربہ کریں۔ اس تربیت میں انھیں یہ اقدامات کرنا ہوں گے: کلامِ محبت، نگاہِ محبت، محبت بھرا لمس، محبت سے بغل گیر ہونا، بوسۂ شفقت اور محبت آمیز مسکراہٹ۔ (المجتمع، کویت، شمارہ ۱۹۵۱، ۷ مئی ۲۰۱۱ء)

عہدِ نبویؐ: اعتدال اور توازن کا بہترین نمونہ

ڈاکٹر نثار احمد

اُمت مسلمہ کی شناخت اور اس کی پہچان جہاں اس کے اللہ کے پیغام کے علَم بردار ہونے کی حیثیت سے ہے وہیں اس کا دوسرا اور لازمی وصف قرآن نے اُمَّۃً وَّسطًا کے زریں الفاظ میں واضح کیا ہے:

قُلْ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ط یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ o وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا o (البقرہ ۲:۱۴۲-۱۴۳) اے نبیؐ! ان سے کہو مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک 'اُمتِ وسط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔

واضح رہے اُمتِ وسط سے مراد ایک ایسی قوم اور انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر عدل و انصاف اور توسط اور میانہ روی کی روش پر قائم ہو، اور جس کا تعلّق سب انسانوں کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلّق ہو اور کسی سے بھی ناحق اور ناروا تعلّق نہ ہو۔ اس کے برعکس انتہاپسندی وہ روش ہے جو راہِ وسط کی ضد ہے۔

انتہاپسندی کے الفاظ بجاے خود شدت و حدّت کو ظاہر کرتے ہیں۔ انتہا کے لفظی معنی ہیں کسی چیز کی آخری حد یا کنارہ۔ کسی دائرے کا آخری گھیرا، کسی صفحے کی آخری لکیر، کسی وسعت کا احاطہ کلّی، خاتمہ، روک یا آخری سرا، جو اسے کسی دوسری حد اور انتہا سے ممتاز و ممیّز کردے۔ حد و انتہا

مادی شکل کی بھی ہوسکتی ہے اور معنوی بھی۔ نیز حدوانتہا کے واقعتاً دو رُخ ہو سکتے ہیں: ایک کم سے کم یا نیچے کی حد یا آخری لکیر سے گر جانا، اور ایک حدونہایت یا غایت وانتہا اُوپر کی طرف، حد سے اُوپر گزر جانا، دائرے سے باہر نکل جانا۔ گویا انتہاپسندی کا اصولاً اطلاق زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم دونوں صورتوں پر ہوسکتا ہے، یعنی افراط اور تفریط دونوں شکلوں میں۔ ان دونوں انتہاؤں (کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ) کے درمیان یا وسط (بیچ)، عدل وقسط اور اعتدال کی منزل ہے۔

روزمرہ گفتگو میں جب انتہاپسندی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے عُرفاً اور عموماً حداعلیٰ و بالا کی طرف ہی بڑھ جانے یا گزر جانے کا اشارہ ہوتا ہے، یعنی سیاسی، معاشی، معاشرتی یا مذہبی کسی بھی معاملے میں حد سے آگے بڑھ جانا۔ حد سے آگے بڑھنے کا رجحان ومیلان جسے ہم انتہاپسندی کہتے ہیں، دراصل عدل واعتدال کو خاطر میں نہ لانے اور وسط وقسط ترک کردینے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اگرچہ 'انتہاپسندی' کا لفظ استعمال نہیں ہوا، تاہم انتہاپسندی کی نمایندگی اور اس کی کیفیت وکمیت کا اظہار دوسرے کئی الفاظ واصطلاحات سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ حدِاعتدال سے آگے بڑھ جانا، یعنی انتہاپسندی دراصل حدود شکنی ہے، ظلم و زیادتی ہے اور اسی کو غلو کہا گیا ہے، یعنی مبالغہ کرنا، حد سے آگے بڑھنا، جب کہ یہی طغیان، اعتدیٰ، افراط اور عدوان ہے۔[1] چنانچہ قرآنِ پاک میں یہ نمایندہ الفاظ واصطلاحات جہاں جہاں پائے جاتے ہیں ان کے سیاق وسباق سے پتا چلتا ہے کہ انتہاپسندی سے ظلم وزیادتی جنم لیتی ہے، جبروجور بڑھتا ہے، تشدد وتغلب پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں قتل وغارت گری، فتنہ وفساد پورے معاشرے میں پھیل جاتا ہے جس کا مشاہدہ ہم آج خود اپنے ملک میں آئے دن کرتے رہتے ہیں۔

انتہاپسندی کا میلان ورجحان یا رویہ خواہ دینی، دنیوی کسی معاملے میں ہو یا انسانی زندگی کے کسی بھی شعبے میں پایا جائے بہرحال عقل ونقل کسی اعتبار سے پسندیدہ نہیں، بلکہ قابلِ مذمت اور انتہائی خطرناک ہے اور مختلف درجات میں مہلک نتائج کو جنم دیتا ہے۔ انتہاپسندانہ رویہ بنیادی طور پر بے اعتدالی اور بے راہ روی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تاہم اور دوسرے بہت سے اسباب کا بھی اس میں عمل دخل ہوتا ہے، مثلاً بعض لوگ طبعاً انتہاپسندانہ طبیعت لے کر پیدا ہوتے ہیں اور انتہاپسندی ان کی سرشت میں ہوتی ہے، جیسا کہ سورۂ علق (آیت ۶) میں فرمایا گیا: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى

(بے شک انسان حد سے نکل جاتا ہے۔ترجمہ: تھانوی)۔

انتہاپسندی کی ایک وجہ لاعلمی، ناواقفیت اور جہالت ہے۔ حدود و قیود سے ناواقفیت بجاے خود حدوں کی پامالی اور ان سے تجاوز کا باعث بنتی ہے اور جہالت میں اکھڑپن، ناشائستگی، عدم برداشت، تشدد اور تغلب سب چیزیں داخل ہیں جو بالآخر انتہاپسندی پر منتج ہوتی ہیں۔ علم، طاقت، عزت، دولت، علم، عقل وغیرہ اگرچہ عطیۂ خداوندی ہیں لیکن اکثر اوقات آدمی اس زعمِ باطل میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ یہ اس کے کسب و محنت کا نتیجہ اور ملکیت ذاتی ہے۔ پھر فخر، غرور، گھمنڈ میں آکر انا ولاغیری کا خبط اس پر سوار ہوجاتا ہے اور وہ انتہاپسندی کی انتہا پر پہنچ کر اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (النازعات ۷۹:۲۴، میں ہوں رب تمھارا سب سے اُوپر۔ ترجمہ: محمودالحسن) کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ یہی فرعونیت ہے۔ قرآن میں مختلف حوالوں سے فرعون کا تقریباً ۷۴ مرتبہ ذکر آیا ہے لیکن اس کی فردِ جرم میں مرکزی شق ہے: اِنَّہٗ طَغٰی (طٰہٰ ۲۰: ۲۴،۴۳، النازعات ۷۹:۱۷) کہ وہ حد سے بہت بڑھ گیا تھا۔ انتہا کی انتہا کو پہنچ گیا تھا جس کی مزید تشریح یہ کی گئی کہ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ط وَ اِنَّہٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَo (یونس ۱۰:۸۳) (اور فرعون ملک میں متکبر و متغلب اور (کبروکفر میں) حد سے بڑھا ہوا تھا۔ ترجمہ: ف م جالندھری)۔ اور فرمایا گیا: اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ (القصص ۲۸: ۴) (بے شک فرعون نے بہت سر اُٹھا رکھا تھا)۔ اس انتہاپسندی کے نتیجے میں اسے نشانِ عبرت بنادیا گیا (النازعات ۷۹:۲۶)۔

انتہاپسندی کے فروغ و افزایش میں بعض اوقات ذاتی غرض و منفعت، حب جاہ و مال و منصب بھی کارفرما حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ وسائل و ذرائع میں جائز و ناجائز، حق و باطل، صحیح غلط کا امتیاز بے معنی ہوجاتا ہے۔ پھر ضد، ہٹ دھرمی، انتقام، انانیت، انتہاپسندی کی راہوں کو پُرپیچ بنا کر انسانیت کو تباہی و ہلاکت سے دوچار کردیتی ہیں۔ اس پہلو سے انتہاپسندی اور دہشت گردی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا کیونکہ دونوں کا بظاہر نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا انسانیت، شرافت اور معاشرتِ باہمی کی خیر اسی میں ہے کہ ان اسباب و محرکات کا بھی قلع قمع کیا جائے جو انتہاپسندی کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کو شرفِ انسانیت کا اعزاز، شرافتِ تہذیب کی خیرات اور تحسین معاشرت کی سوغات صرف اُس وقت نصیب ہوئی، جب حضور سیّدعالم صلی اللہ علیہ وسلم

اس دنیا میں تشریف لائے۔

آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے، عرب کے جاہلی معاشرے میں جس وقت رسولِ رحمت کی بعثتِ مبارکہ ہوئی تو احوال و کیفیات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ اُس معاشرے کی نمایاں ترین خصوصیّت انتہاپسندی تھی۔ جس طرح انسانی زندگی کے ہزار رنگ ہیں، انتہاپسندی کے انواع و اقسام بھی بے شمار ہیں۔ تاہم سب دائروں کا مرکز مذہبی انتہاپسندی میں مرتکز تھا۔ مذہبی انتہاپسندی کا سب سے بڑا مظہر شرک و بت پرستی تھا اور شرک و بت پرستی کا محور و مرکز اُس گھر کو بنا دیا گیا تھا جو اصلاً اللہ کا گھر، خدا پرستی کا مرکز اور نشرگاہِ توحید تھا۔ توحید اللہ کی وحدانیت و یکتائی ہے۔ بے مثل، بے عیب، وحدہٗ لاشریک وہی ہے۔ یکتا و تنہا ذات مالک الملک ذوالجلال والاکرام وہی ہے۔ تصورِ حقانیت اور حقیقت میں عدل و قسط کی نمایندہ توحید ہے، جب کہ شرک ایک سے زیادہ بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں خداؤں کا یقین خلافِ حقیقت بھی ہے اور ذہنی، تصوراتی انتہاپسندی بھی ہے۔ نیز جہالت و ظلم کی نمایندہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمٰن ۳۱:۱۳)۔

عرب جاہلیّت میں انتہاپسندی اگرچہ ذہنی و عملی ہزار شکلوں میں موجود تھی لیکن اس کا سب سے بڑا مظہر مذہبی انتہاپسندی کی صورت میں نمایاں تھا۔ چنانچہ حضور نبی کریمؐ کا اپنے مخاطبین، یعنی مشرکینِ مکہ سے ایک یہی تو مطالبہ تھا کہ وہ صرف ایک کلمہ (توحید/ اسلام) کا اقرار کرلیں تو عرب و عجم کی بادشاہی ان کے قدموں میں ہوگی۔ یہ ایک کلمۂ توحید/کلمۂ اسلام ان کی انتہاپسندانہ مشرکانہ زندگی پر خطِ تنسیخ پھیر رہا تھا۔ وہ بلبلا اُٹھے۔ وہ کلمہ، اس کی دعوت، اس کے اثرات، اس کے تقاضے ان کے مذہبی شب و روز، ان کی معاشرتی زندگی، ان کے معاشی فوائد، ان کی بداخلاقیاں، سب کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو رہے تھے۔ شرک بقول قرآن ظلم ہے، اس لیے مشرکوں ظالموں نے انفرادی طور پر موحد اہلِ ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جس سے خود ذاتِ رسالت مآبؐ بھی مستثنیٰ نہ تھی۔ پھر اجتماعی طور پر انتہاپسندی کا مظاہرہ چھے سال بعد ہی مشرکین مکہ، یعنی قریش نے اس طرح کیا کہ نہ صرف حضورؐ بلکہ بنومطلب سمیت پورے خاندانِ بنوہاشم کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کر دیا۔ اس ظالمانہ سلوک اور اجتماعی انتہاپسندی کا سلسلہ تین سال تک برابر جاری رہا۔ ایسے ظالمانہ سلوک اور انتہاپسندی کی اس سے پہلے عرب کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن جب

کفارومشرکین مکہ کی معاندانہ کوششوں اور ظالمانہ کارروائیوں کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی مساعی نے مدینہ میں بھی کامیابی حاصل کرلی تو کفارومشرکین کی انتہاپسندی عروج پر پہنچ گئی، اور انھوں نے دارالندوہ کے ایک خصوصی اجلاس میں آقاے رسالتؐ کے قتل کا منصوبہ بناڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپؐ تقدیر و تدبیر الٰہی کے تحت شمشیر بردار مشرکوں کے محاصرے سے ہجرت کی رات بخیروعافیت نہ نکل جاتے تو انھی لمحات میں دہشت گردی کا ایک بہت بڑا واقعہ ظہور پذیر ہوجاتا۔

ہجرتِ نبویؐ کے بعد ریاست مدینہ قائم ہوجانے اور قوت و شوکت حاصل ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشِ مکہ کی انتہاپسندی کا جواب انتہاپسندی سے نہیں دیا، بلکہ ایک محتاط، معتدل، ترقی یافتہ معاشرے کی داغ بیل ڈالی اور اس کا عملی نمونہ سب سے پہلے خود اُس مدنی معاشرے کی ازسرِنو تبدیلی سے فرمایا جہاں آپؐ نے قدم رنجہ فرمایا تھا اور جہاں انتہاپسندانہ مزاجی حالات نے اس خطے کے باشندوں کے لیے جہنّم زار بنا دیا تھا۔ آپؐ کی آمد اور آپؐ کی مساعیِ جمیلہ سے مدینہ طیبہ، جنت نشان قرارِ جاں بن گیا۔ اس خوش گوار تبدیلی کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۳) اور یاد کرو احسان اللہ کا، اپنے اُوپر، جب کہ تھے تم آپس میں دشمن، پھر اُلفت دی تمھارے دلوں میں، اب ہوگئے اس کے فضل سے بھائی بھائی، اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے، پھر تم کو اس سے نجات دی۔ (ترجمہ شیخ الہند)

حضور نبی کریمؐ نے یثرب کی اُس سرزمین کو (جہاں بدامنی، قتل و غارت گری، لاقانونیت کا دور دورہ تھا، جہاں کسی کی جان، مال، عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، جہاں اوس وخزرج اور یہودی قبائل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے، جہاں نراج کی حکمرانی تھی اور انتہاپسندی عام تھی) امن وامان کا گہوارہ بنادیا۔ عدل واحسان کی حکمرانی سے متمتع کیا۔ ایک قانون اور ایک دستور کا پابند کیا۔ ہرقسم کی انتہاپسندی کو ممنوع ٹھیرایا۔ خوں آشام قبائل کو شیروشکر کیا، نراج کو راج سے بدلا، ایک مرکز عطا کیا۔ اخلاق، مروّت، اخوت، اعتدال کی فضا قائم کی۔ پوری بستی کے حدود کو حرم قرار دیا

اور ایک شہر بے مایہ کو تاجدارِ مدینہ نے مدینہ بنا کر مفتخر [فخر کرنے والا] کیا۔ اب جو اُمت تشکیل پائی وہ 'اُمتِ وسط' قرار دی گئی۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ ۲:۱۴۳) (اور اس طرح ہم نے تم کو اُمت وسط/ اُمت معتدل بنایا ہے)۔ اُمت معتدل، موضح القرآن کے مطابق: ''وہ اُمت ہے جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ عیسائیوں نے افراط اختیار کی کہ حضرت عیسٰیؑ کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور یہودیوں نے تفریط دکھائی کہ ان کی پیغمبری کو بھی نہ مانا۔ اُمت معتدل نے نہ ان کو حد سے بڑھایا نہ گھٹایا بلکہ ان کے درجے پر رکھا'' (حاشیہ ف م جالندھری، ص ۳۵)۔ حاشیۂ عثمانی کے مطابق: وسط، یعنی معتدل کا یہ مطلب ہے کہ یہ اُمت ٹھیک سیدھی راہ پر ہے جس میں کچھ بھی کجی کا شائبہ نہیں اور افراط وتفریط سے بالکل بری ہے'' (ص ۲۷)۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں: الوَسَط (بفتح السین) اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو دو مذموم اطراف کے درمیان واقع ہو، یعنی معتدل جو افراط وتفریط کے بالکل درمیان ہوتا ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ معنی اعتدال کی مناسبت سے یہ لفظ عدلٌ نصفة سواءٌ کی طرح ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ اس معنی میں اُمت مسلمہ کے متعلّق فرمایا گیا۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ ۲:۱۴۳)۔ (راغب اصفہانی، ص۹۷۴)

یہ کہنا گویا عین حقیقت ہے کہ اُمت مسلمہ یا مسلمانوں کا بحیثیت اُمتِ وسط دائرۂ حیات اعتدال وتوسط کے گرد ہی گھومتا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں کارفرمائی میانہ روی کی ہے، تاکہ انفرادی واجتماعی زندگی کا ہر گوشہ توازن وہم آہنگی سے ہم کنار ہو اور کسی قسم کی بے اعتدالی، ناروا زیادتی، غلو اور انتہاپسندی سرزد نہ ہونے پائے۔ دین اسلام کی یہ ایسی بنیادی صفت ہے کہ حضور اکرمؐ سے پہلے آنے والے تمام انبیاؑ ورسل بھی اس اہم مقصد کے لیے کوشاں رہے کہ عدل وقسط قائم ہو، اور کتب وصحائف کا نزول بھی اسی غرض سے ہوا کہ لوگ راستی ومیانہ روی کو اپنی زندگیوں میں جاری وساری کریں (ملاحظہ ہو سورۂ حدید ۵۷، آیت ۲۵)۔ آپؐ کا لایا ہوا دین تو سرتاسر عدل وقسط، اعتدال واقتصاد (میانہ روی) کا آئینہ دار ہے۔ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جہاں اس کی کارفرمائی نہ ہو یا اسے نظرانداز کر دیا گیا ہو۔ درحقیقت اس دین فطرت میں ظاہر وباطن کا ہر جلوہ، اور فکر وعمل کا ہر ذرّہ مبنی برعدل ہے، اور جلوہ ہائے نبوت سے ہم آہنگ ہے۔ بروایت

حضرت عبداللہ بن سرجسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حسنِ سیرت (نیک چال چلن)، بُردباری اور میانہ روی نبوت کے اجزا میں سے ۲۴واں حصّہ ہے''۔(ترمذی، مشکوٰۃ)

قرآن وحدیث میں مسئلہ زیر بحث کے دونوں پہلوؤں پر جگہ جگہ احکام و ہدایات سے نوازا گیا ہے۔ اس پہلو سے بھی کہ عدل و اعتدال، اقتصاد و میانہ روی اختیار کی جائے جو اس بات کو مستلزم ہے کہ فکروعمل کی ہر چیز اور نظام و انتظام کا ہر عنصر اپنے اپنے دائرے میں ٹھیک ٹھیک کام کرے اور مطلوبہ مثبت نتائج پیدا کرے، دوسری طرف کسی معاملے میں حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اعتدیٰ، عدوان، طغیان وعصیان سے پرہیز کیا جائے کہ یہیں سے غلو، تجاوزِ بے جا اور انتہاپسندی کی مختلف جہتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو اپنی سنگینی میں دہشت گردی سے مماثل ہوجاتی ہیں۔

اسلام کا مزاج بہرحال اور بحیثیت مجموعی، قسط واعتدال سے ہی عبارت ہے کہ یہ تعمیر باطن بھی کرتا ہے اور ظاہر کو بھی درست رکھتا ہے۔ حکم ہے: اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (المائدہ ۵:۸) ''عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے''۔ دل میں کھوٹ اور ناجائز خواہشات ہی بے راہ روی و بے اعتدالی کی پرورش کرتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا: فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا (النساء ۴:۱۳۵) ''لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو''۔ اللہ تو بہرصورت عدل کی ہی تلقین کرتا ہے: ''ان سے کہو، میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے''۔ (الاعراف ۷: ۲۹)۔ اس لیے اہلِ ایمان کو اس کی تابعداری لازم ہے۔ کیونکہ اللہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے، ان سے محبت رکھتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ (الحجرات ۴۹:۹، المائدہ ۵:۴۲، الممتحنہ ۶۰:۸)۔ سورۂ لقمان میں فرمایا گیا کہ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْيِكَ (لقمٰن ۳۱:۱۹) ''چال میں میانہ روی اختیار کرو''۔

یہ میانہ روی زندگی کے ہر معاملے، ہر گوشے میں مطلوب ومحمود ہے۔ ارشاد رحمۃ للعالمینؐ ہے: ''حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوش حالی میں میانہ روی کیا ہی خوب ہے، ناداری میں اعتدال کی روش کیا ہی اچھی ہے، اور عبادات میں میانہ روی کیا ہی بہتر ہے'' (مسند بزاز، کنزالعمال)، (عبدالغفار حسن، انتخابِ حدیث، ص ۶۶)۔ یہ روش، یہ رویہ ہرلحاظ سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔ یہ ارشاد رسالت مآب کیسا معنی خیز ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

دین آسان ہے۔کوئی شخص دین سے زور آزمائی نہ کرے کیونکہ یہ دین اس پر غالب آ کر رہتا ہے۔ اس لیے سیدھے رہو۔ میانہ روی اختیار کرو اور ہشاش بشاش رہو (ایضاً، ص ٦٦، ٦٧)۔ ایک اور حدیث قدسی میں ہے کہ ''مومن کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے''۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ مومن اپنے آپ کو ذلیل کیسے کرتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ناقابلِ برداشت (طاقت سے زیادہ) آزمایش میں خود اپنے آپ کو ڈالتا ہے۔(ترمذی، مشکوٰۃ)

اس لیے یہ بات طے ہے کہ انصاف اور اعتدال و میانہ روی ترک کرنے سے ہی انتہاپسندی کو فروغ ملتا ہے۔ انتہاپسندی، اعتدیٰ، عدوان، ہرصورت میں منع ہے۔ چنانچہ مختصر الفاظ میں مگر جامع انداز میں یہ حکم دے دیا گیا کہ وَ لَا تَعْتَدُوْا 'حد سے آگے نہ بڑھو' (المائدہ ۵:۸۷)۔ سورۂ بقرہ میں یہ مضمون کئی جگہ بیان ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (البقرہ ۲:۲۲۹) ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں سو اس سے آگے مت بڑھنا''۔ اور دوسری جگہ فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ○ (البقرہ ۲:۱۹۰) ''بے شک اللہ حد سے آگے بڑھ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ انتہاپسندی کی مذمت دوسرے الفاظ میں اس طرح کی گئی: وَ لَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ○ (ھود ۱۱:۱۱۲) ''اور حد سے تجاوز نہ کرنا، اللہ تمھارے سب اعمال کو بخوبی دیکھ رہا ہے''۔ یہی حکم سورۂ طٰہٰ میں مکرر دیا گیا (طٰہٰ ۲۰:۸۱)۔ حدود سے تجاوز کرنے والوں (للطاغین) سرکشوں کو بُرے ٹھکانے کی وعید سنائی گئی ہے (صٓ ۳۸:۵۵)۔ یہی وعیدِ جہنّم سورۂ نبا (۷۸:۲۲) میں بھی مذکور ہے۔ مذہبی انتہاپسندی تو اور بھی زیادہ دین و دنیا دونوں جگہ خسارے کا باعث ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہود و نصاریٰ، اہلِ کتاب کو سرزنش کرتے ہوئے گویا اہلِ ایمان کو بھی تنبیہ کردی گئی کہ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (النساء ۴:۱۷۱) ''اپنے دین کے معاملے میں حد سے آگے نہ بڑھو، غلو سے کام نہ لو''۔ نیز دین میں غلو یا انتہاپسندی میں دوسرے لوگوں کے آلۂ کار بننے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ یہ بھی احتیاط ضروری ہے کہ کسی ظلم و زیادتی اور انتہاپسندی کے کاموں میں نہ تو کسی سازش اور منصوبہ بندی کا حصّہ بنیں۔ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المجادلہ ۵۸:۹)، اور نہ اس قسم کے کاموں میں مدد و تعاون بہم پہنچائیں۔

تعلیماتِ نبویؐ سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی انتہاپسندی کی وہ شکل و صورت جو بظاہر

بڑی معصوم ہے اور جس میں کسی دوسرے کا نقصان بھی نہیں ہے، لیکن بہرحال اعتدال سے تجاوز اور غلو پایا جاتا ہے، اس لیے وہ بھی شرعاً ممنوع ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اس قسم کی کسی بے اعتدالی کی خبر ملتی تو آپؐ اس کا فوری نوٹس لیتے اور اصلاحی تدابیر اختیار فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمر بن العاصؓ کے بارے میں جب ہمہ تن مصروفِ عبادت ہونے کی اطلاع ملی تو ان کو فوراً بلا بھیجا۔ بخاری کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اے عبداللہ! کیا مجھے یہ اطلاع نہیں ملی ہے کہ تم دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات کو قیام کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، ایسا ہی کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرو۔ روزہ رکھو اور افطار بھی کرو، رات کو تہجد بھی پڑھو اور آرام بھی کرو۔ اس لیے کہ تمھارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے(بخاری، مشکوٰۃ)، (عبدالغفار حسن، انتخابِ حدیث، ص ۶۸-۶۹)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھے کو دیکھا کہ وہ اپنے دو بیٹوں کے درمیان پاؤں گھسیٹتے ہوئے جارہا ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: اسے کیا ہوگیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ اس نے نذر مانی ہے کہ بیت اللہ کا سفر پیدل کرے گا۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کے اپنے آپ کو اذیت دینے سے بے نیاز ہے۔ اور اسے حکم دیا کہ وہ سواری پر سوار ہوکر اپنا سفر پورا کرے۔ (ایضاً)

بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ایک مسجد (البیت) میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ چھت کے کنڈوں سے بندھی ایک رسی لٹک رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ماھذا الحبل؟ یہ رسی کیسی ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ (ایک عورت) زینب نے اپنے لیے لٹکا رکھی ہے کہ جب تھکن سے اونگھ آنے لگتی ہے تو اپنے آپ کو اس سے لٹکا لیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا: اس کو فوراً کھول ڈالو۔ تم میں کوئی اس وقت تک نماز پڑھے جب تک کہ نشاط و فرحت رہے، جب اونگھ آنے لگے تو اسے چاہیے کہ سوجائے۔ (امام نووی، ریاض الصالحین، ص ۵۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات انتہاپسندی کا ارتکاب لاعلمی میں یا نادانستہ طور پر

بھی ہوجاتا ہے، اور بعض اوقات کچھ نادیدہ محرکات وقتی جذبات و احساسات کے تحت بھی انتہاپسندی سرزد ہوجاتی ہے۔ حاصلِ گفتگو یہ کہ انتہاپسندی اور غلو چاہے اس کی نوعیت، شکل اور اظہار کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، دین کے نزدیک بہرحال پسندیدہ اور مستحسن نہیں، بلکہ اس کے خاتمے کے لیے شعوری کوششوں کی ضرورت ہے اور مذہبی انتہاپسندی کا امتناع تو بدرجہ اولیٰ لازم ہے۔ مگر یہ احتیاط لازم ہے کہ انتہاپسندی کی نوعیت و ماہیت کو پہلے سمجھ لیا جائے۔ اس لیے کہ کسی مقصد کے لیے جدوجہد، تحریک، ترغیب اور تخریب کے خطوط بہت قریب سے گزرتے ہیں اور دفع و استیصال کے لیے پہلے حکمت و تدبیر اور تحمل کو کام میں لانا چاہیے اور آخری چارۂ کار کے طور پر طاقت کا استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ اس بات کا بہت اندیشہ ہے کہ نشۂ طاقت ہی کہیں خرابی کا باعث نہ بن جائے ؎

صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

حواشی

۱- ملاحظہ ہو: ظلم حد سے گزرنا ہی ہے: وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ (الطلاق ۶۵:۱) وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ ۲:۲۲۹) ۔غلو بھی حد سے گزرنا۔ غلا یغلو غَلواً و غُلُواً، مبالغہ کرنا، حد سے بڑھنا (المنجد، ص ۸۸۶)۔ قرآن میں ہدایت ہے: يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (النساء ۴:۱۷۱)۔ اور فرمایا گیا: قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (المائدہ ۵:۷۷)۔ طغٰی طغا طغی طغیاً وطغیاناً طُغواً وطغوا وطغواناً- جاوزالقدر والحد۔ حد اور اندازہ سے تجاوز طغیان ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسٰیؑ کو فرعون کی طرف یہ کہہ کر بھیجا گیا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ ۲۰:۲۴) ''تم فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ حد سے زیادہ بڑھ چکا ہے''۔ گویا حدود فراموش، حدود شکن، سرکش ہوگیا ہے۔ پھر حضرت موسٰیؑ و ہارونؑ دونوں کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دوبارہ انھی الفاظ میں مذکور ہے۔ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ ۲۰:۴۳)۔ یہی تکرار سورۃ النازعات میں بھی (۷۹:۱۷) ہے۔ حدود شکنی، سرکشی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى (العلق ۹۶:۶) ۔قومِ ثمود و فرعون کا جرم سرکشی و حدود شکنی ہی تھا۔ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ (الفجر ۸۹:۱۱) جو فتنہ و فساد کا موجب ہوتا ہے۔ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (الفجر ۸۹:۱۲) ۔اس لیے حکمِ ربانی یہ ہے روزمرہ

باتوں (مثلاً کھانے پینے) میں بھی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ وَ لَا تَطْغَوْا (طٰہٰ ۲۰:۸۱) اعتدیٰ اور عداون۔ دونوں کا مآخذ و مادہ ایک ہے عدو (ع دو)۔ علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ العدو کے معنی حد سے بڑھنے اور باہمی ہم آہنگی نہ ہونا ہے۔ اگر اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہو تو یہ عداوۃ اور معاداۃ کہلاتی ہے اور اگر رفتار سے ہو تو اسے عدوۃ کہا جاتا ہے۔ اور اگر عدل و انصاف میں خلل اندازی کی صورت میں ہو تو اسے عُدوان اور عدوٌ کہا جاتا ہے۔ (اصفہانی، امام راغب، مفردات القرآن، محمد عبدہٗ الفلاح الفیروز پوری، المکتبۃ القاسمیہ، لاہور۔ طبع اوّل، ۱۹۶۳ء، ص ۲۰۳)۔ اعتداء، حد سے آگے بڑھنا یا بقول علامہ راغب حق سے تجاوز کرنے کے ہیں (ایضاً)۔ حکم ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو (البقرہ ۲:۲۲۹)۔ حد سے نکلنے والے عادون (مومنون ۲۳:۷) اور معتدین ہیں جن کو اللہ پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲:۱۹۰، نیز المائدہ ۵:۸۷، الاعراف ۷:۵۵)۔ ظلم و زیادتی میں حد سے گزرنا عدوان ہے۔ زیادتی کا بدلہ لینے میں بھی عدوان سے پرہیز کا حکم دیا گیا (البقرہ ۲:۱۹۳، النساء ۴:۳۰)۔ بقول امام راغب الافراط کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر جانے کے ہیں۔ اور سورۂ کہف (آیت ۲۸) میں یادِ الٰہی سے غفلت میں پڑنے والا خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ جانے والا (وکان امرُہٗ فُرطاً) ہے (ایضاً، ص ۲۹۸)۔ یعنی افراط و تفریط میں حد سے بڑھا ہوا۔ (ایضاً)

مقالہ نگار شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی میں پروفیسر رہے۔

اسلامی نظام: سیاسی ذرائع سے قیام ممکن ہے؟

ڈاکٹر انیس احمد

نوجوان نسل کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتی ہے۔ اگر نوجوانوں میں عزم، خوداعتمادی، اللہ پر انحصار، صبر، پُراُمیدی، محنت کشی اور منزل کا شعور پایا جائے تو وہ قوم مشکل ترین حالات سے بآسانی نکل کر ترقی کے کٹھن مراحل کو بہ سہولت طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اگر کسی قوم کے نوجوانوں میں بے روزگاری، عدم تحفظ، نفسیاتی دہشت گردی اور مستقبل کے تاریک ہونے کا احساس بٹھا دیا جائے اور ابلاغِ عامہ خصوصاً یہ کوشش کرے کہ ملک میں ہونے والی ہر ہر بُرائی کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے کہ گویا ملک میں نہ کوئی نظم ہے، نہ تحفظ، نہ ترقی کی صلاحیت تو وہی نوجوان جو قوم کا اثاثہ اور مستقبل کے معمار ہوتے ہیں اس نفسیاتی حربے کا شکار ہوکر عموماً تین راستوں پر چل پڑتے ہیں۔

تبدیلی کی راہیں اور حکمت عملی

پہلا راستہ فرار کا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملک کے باہر جہاں کہیں خوابوں کی جنت کی خوشبو سونگھ سکتے ہوں وہاں قرض رقم لے کر ایسے اداروں اور افراد کے ذریعے جو بیرونِ ملک روزگار کا ٹھیکہ لیتے ہیں، ملک سے فرار ہو جائیں یا حکومتی اسکالرشپ پر جاکر ملک کے باہر ہی بیٹھ جائیں اور واپس نہ آئیں۔

دوسرا راستہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر زمینی حقائق کو نظرانداز کرتے ہوئے زبان سے حالات کا ماتم لیکن زمانے کی ہوا کے ساتھ اپنے آپ کو اُڑانے کی کوشش، چنانچہ وہ سول سروس کے ذریعے ملازمت کا حصول ہو یا کسی سفارش اور جعلی ڈگری کے ذریعے صوبائی یا مرکزی پارلیمنٹ میں ممبرشپ یا کسی زمین کے مافیا کے ساتھ شامل ہوکر عوام کو لوٹنا، غرض کرپشن اور مادہ پرستی کے چنگل میں

پھنس کر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اِس دنیا میں کامیاب ہورہے ہیں۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے وہ جو کل تک ویگنوں میں سفر کرتے تھے، دھوکے سے حاصل کی ہوئی دولت کے سہارے بڑی بڑی گاڑیوں میں پھرتے نظر آتے ہیں۔

تیسرا راستہ جو نوجوان اختیار کرتے ہیں وہ موجودہ نظام کو چاہے وہ مصر میں ہو یا پاکستان میں، شام میں ہو یا تیونس میں، وہ اس فرسودہ، مادہ پرست اور ظلم پر مبنی نظام کو، طاغوت، کفر اور شرک سے تشبیہ دیتے ہوئے قوت کے استعمال سے اس کے خلاف 'جہاد' کا اعلان کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ راتوں رات اداروں پر قبضہ کر کے ملک میں شریعت، اسلامی حکومت، معروف، بھلائی اور عدل کے نظام کو قائم کر دیا جائے۔ یہ راستہ دیکھنے میں بہت کم مسافت کا نظر آتا ہے اور پھر اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قوت کے ذریعے، مناسب منصوبہ بندی کے بعد بھی اگر وہ تبدیلی لانے میں کامیاب نہ ہوں تو چونکہ 'جہاد' کرنے والے کے لیے ہر دو شکلوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے تو یہ نوجوان اپنی جان کو اس راستے میں قربان کرنے ہی میں اپنی فلاح سمجھتے ہیں۔

اگر تینوں راستوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تیسرے راستے والے بظاہر ہر لحاظ سے کامیاب نظر آتے ہیں کہ اگر دنیا میں کامیاب ہوئے تو کم عرصے میں کام کرنے کے باوجود تبدیلی لے آئیں گے اور اگر کامیاب نہ ہوئے جب بھی آخرت تو بن گئی۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے ماضی کے تمام گناہ، غلطیاں، بے راہ روی ہر ہر بُرائی معاف ہوجائے اور شہادت کے حصول کے بعد وہ سیدھا جنت میں جائے، جہاں اللہ کی ساری نعمتیں اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔

ایک بات جوان تینوں راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرتے وقت غور کرنے اور خلوصِ نیت کے ساتھ اپنے آپ کو تمام تصورات سے آزاد کر کے سوچنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن وسنت جن کے نفاذ اور قیام کے لیے یہ ساری جدوجہد کی جاتی ہے وہ خود کس راستے کی طرف بلاتے ہیں۔ کیا وہ دنیا طلبی، مفاہمت، وقت پرستی یا پھر بس شہادت کے حصول اور طلب کو مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں یا شہادتِ حق کے فریضے کی ادایگی کے لیے انبیاے کرامؑ کے اسوہ اور خصوصاً خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

کسی بھی مسلمان کے لیے وہ جوش اور ولولے سے بھرا ہوا نوجوان ہو یا سکون و ٹھیراؤ کے ساتھ سوچنے والا معمر شخص، جو بات فیصلہ کن ہے وہ اس کا اپنے ذہن سے ایک تصور قائم کر لینا نہیں ہے بلکہ قرآن اور سنت رسولؐ اللہ کی سند اور دلیل کی بنیاد پر اپنے لیے لائحہ عمل طے کرنا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات اس تعمیری عمل میں ایک سے زائد لائحہ عمل ایسے ہو سکتے ہیں جو قرآن و سنت سے مطابقت رکھتے ہوں۔ ایسی شکل میں سنت کا اصول سیدہ عائشہؓ کی روایت کی روشنی میں وہ ہے جو زیادہ 'یسر' پر مبنی ہو اور جس کی دلیل سنتِ رسولؐ میں پائی جاتی ہو۔

گویا راستے کا تعین، حکمت عملی کا انتخاب اور تبدیلی کا طریقہ طے کرتے وقت منزل محض حصولِ شہادت نہیں ہو سکتی بلکہ حق کی شہادت دینے کے لیے وہ تمام ذرائع اختیار کرنے ہوں گے جو سنتِ نبویؐ سے ثابت ہوں اور جو آخر کار شہادت تک لے جانے والے ہوں۔

انبیاے کرامؑ کی حکمت عملی

انبیاے کرامؑ کی بنیادی دعوت حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم النبیینؐ تک صرف یہی رہی ہے کہ تمام انسان اپنے خالق، مالک اور رب کی بندگی میں آ جائیں اور اللہ جل جلالہٗ کے سوا تمام بندگیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر کے اس کے عبد یا تابع دار بن جائیں۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۱۶:۳۶) ہم نے ہر اُمت میں ایک رسولؑ بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی اختیار کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

عبدیت قرآنِ کریم کی ایک جامع اور اہم اصطلاح ہے جس میں نہ صرف نماز اور دیگر عبادات بلکہ زندگی کے تمام ممکنہ معاملات میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو حاکم، مالک، آقا اور فیصلہ کرنے والا تسلیم کیا جانا شامل ہے۔ ایک مسلمان اسلام لانے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی حد تک تو اللہ ہی کی عبادت یا بندگی اختیار کروں گا لیکن میرے سیاسی معاملات لادینی جمہوریت کے اصول طے کریں گے اور معاشی معاملات کو سرمایہ دارانہ معیشت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا اور معاشرتی، ثقافتی معاملات میں فلاں علاقہ یا ملک کے کلچر اور روایات پر عمل کروں گا۔ اسلام میں داخل ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک فرد اسلام میں پورے کا پورا داخل ہو۔

ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (البقرہ ۲:۲۰۸) ''اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو وہ تمھارا کھلا دشمن ہے''۔

آیت مبارکہ بلا کسی ابہام کے یہ بات واضح کرتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کرسکتا۔ وہ یہ نہیں کرسکتا کہ جمعہ کے دن وہ اللہ کا بندہ ہو، جب کہ تجارتی معاملات میں سرمایہ دارانہ نظام کا تابع ہو اور سیاسی معاملات میں مفاد پرست، لادینی سیاسی نظام پر ایمان لے آئے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک ماننے کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے تمام ذاتی، گھریلو، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی معاملات میں ایک فرد اور جماعت صرف اور صرف اللہ کی حاکمیت پر ایمان رکھے اور اس کا عمل اس کی شہادت پیش کرے۔

کلمۂ شہادت کا مطلب ہی یہ ہے ایک شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کو اپنے تمام معاملات میں حاکم اور شارع مان کر اسلام میں داخل ہو رہا ہے۔ عقیدہ اور ایمان، اسلام کی نگاہ میں ایک خفیہ اور ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک عوامی شہادت (public testimony) ہے کہ ایک شخص اپنے دل و دماغ اور عمل سے صرف اللہ کی بندگی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر راضی ہوگیا ہے۔

بعض سادہ لوح افراد اسلام میں داخل ہونے اور اسلام کے نفاذ کے عمل کو دو مرحلوں میں تقسیم کردیتے ہیں، جب کہ یہ ایک ہی مرحلے سے تعلّق رکھنے والا عمل ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ پہلے لاالٰہ کا عمل ہوگا اس کے بعد الا اللہ کا۔ ہمارے علم میں نہ قرآن میں اور نہ سنت مطہرہ میں کوئی ایسی شہادت ہے، جو اس تعبیر کی تصدیق کرتی ہو۔ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ ہو یا مدینہ منورہ، جہاں کہیں بھی کسی نے دعوتِ اسلام کو قبول کیا تو اسلام میں پورے داخل ہونے کے ساتھ ہی کیا۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ پہلے مرحلے میں صرف کفروشرک کا رد کیا جائے اور پھر کسی دوسرے مرحلے میں اللہ کی بندگی اختیار کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کو رب اور مالک ماننے کا مطلب بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ اس کے علاوہ سب کا انکار کیا جائے، 'لاالٰہ' اور 'الا اللہ' ایک ہی عہد اور میثاق کا حصّہ ہیں، اس لیے شہادت کو دو مراحل میں تقسیم کرنا ایک غیرضروری بحث ہے۔ اللہ کی بندگی کی مثبت دعوت خود بخود تمام منفی تصورات کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑ کر انسان کے دل و دماغ اور عمل کو توحید کے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ مکہ کے دورِ ابتلا میں دعوتِ توحید قبول کرنے والے ہرمتنفس کو اس بات کا مکمل شعور تھا کہ

اللہ کو ماننے کا مطلب ہی تمام خودساختہ خداؤں کا رد اور انکار ہے۔ اگر مسئلہ محض مکہ کے اندر مانے جانے والے ۳۶۰ سے زائد خداؤں میں ایک اور کے اضافے کا تھا تو اس پر مشرکینِ مکہ کو نہ کوئی اعتراض تھا، نہ شکایت۔ اگر وہ ۳۶۰ بتوں سے تعلقات بنا کر رکھ سکتے تھے تو اس میں ایک کے اضافے سے انھیں کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ اصل مسئلہ یہی تھا کہ ایک اللہ کو ماننے کے بعد وہ ۳۶۰ سے زائد خدا سب کے سب بے اصل اور بے اثر ہو جاتے۔ شرک کا آسان سا مطلب یہی ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ دوسروں کو اس کی ذات یا صفات میں شامل کرلیا جائے۔ مشرکین میں سے بھی بعض افراد اللہ کو مانتے تھے۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جب یہ مشرکین سمندر میں طوفان میں گِھر جاتے ہیں اور انھیں اپنی مضبوط کشتی ڈولتی اور ڈوبتی نظر آتی ہے تو وہ اللہ ہی کو پکارتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب سفر پر جانا ہو، جنگ کرنی ہو، اولاد کی خواہش ہو یا بارش کی ضرورت ہو تو وہ اپنے مقرر کردہ خداؤں ہی سے رجوع کرتے تھے۔

آج کے جدید دور میں ان خداؤں کے نام بدل گئے ہیں۔ کسی کا نام آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک ہے، جس سے لوگ قرضوں کی التجا کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ہماری روزی اور روزگار دینے والا خدا یہی ہے۔ بعض کسی نام نہاد عالمی طاقت کو اپنی فرماں برداری کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ انھیں اقتدار پر قابض رہنے میں مدد فراہم کرے گی اور وہ اُس کے سہارے عوام پر حکومت کرسکیں گے۔ بعض اپنے ملکی دفاع کے لیے کسی بڑی عسکری طاقت کے قدموں کو بوسا دیتے ہیں کہ وہ انھیں اسلحے کی بھیک دے کر ان کے دفاع کو مضبوط بنانے کا ضامن بن سکے۔ یہ نئے ادارے اور نام ایجاد کرنے کے ساتھ اگر ایک شخص یہ ایمان رکھتا ہو کہ وہ بندہ تو اللہ کا ہے لیکن خادم کسی بیرونی مالی طاقتوں کا یا کسی نام نہاد عسکری قوت کا یا کسی ثقافتی سامراج کا ہے تو یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کی تعریف میں آئیں گے۔

توحید اسلام کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ کمال بھی۔ یہ ہر ہر معاملے میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک اور آقا ماننے کے عمل کا نام ہے۔ حضرت نوحؑ سے لے کر خاتم النبیینؐ تک اللہ کے ہر نبیؑ نے صرف ایک دعوت دی کہ اپنے تمام معاملات کو اللہ کے لیے خالص کرو۔ اسلام نے جن بتوں کو پاش پاش کیا ان میں نہ صرف عصبیت، قبائلیت، نسلیت، لسانیت کے بت تھے بلکہ وہ

تمام تصورات بھی شامل تھے جنھیں انسانوں نے اپنے ذہن اور قیاس کی بنا پر قائم کرلیا تھا، اسلام ان سب کا رد کرنے کا نام ہے اور دعوت الی الحق کا واضح مطلب ہی یہ ہے کہ اپنے تمام معاملات میں صرف اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم مان لینا اور اس کی شہادت اپنے عمل سے دینا۔ اسلامی معاشرے اور ریاست کے قیام کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی وقانونی تمام معاملات کو طاغوت کے نظاموں کے اثر سے مکمل طور پر آزاد کر کے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کی بنیاد پر اور اس کی رہنمائی کی روشنی میں مرتب اور منظم کیا جائے۔ دورِ جدید کی تمام تحریکاتِ اسلامی کا، وہ جماعت اسلامی پاکستان ہو یا اخوان المسلمون یا جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر یا جماعت اسلامی ہند، ان سب کی دعوت کا بنیادی ستون ہی قیامِ حاکمیت الٰہی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان نے قیامِ پاکستان سے قبل اور اس کے بعد اسی بنیادی دعوت کی طرف اللہ کے بندوں کو بلایا ہے اور اسلامی ریاست اور معاشرے کے قیام کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں ایک بتدریج تبدیلی کی حکمت عملی وضع کی ہے۔ اس حکمت عملی میں رہنما اصول انبیاے کرام کا طریق دعوت اور قیام حاکمیت الٰہی کے لیے ان کی حکمت عملی کی روشنی میں لائحہ عمل کو وضع کرنا شامل ہے۔

مغربی لادینی جمہوریت

جدید تحریکاتِ اسلامی کے مفکرین امام حسن البنا شہید ہوں یا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی یا سید قطب شہید یا ڈاکٹر محمد ناصر، ہر صاحب علم نے مغربی لادینی جمہوریت کی فکری بنیادوں کو رد کرتے ہوئے ہی اسلامی ریاست کو بطور متبادل نظام کے پیش کیا اور جو تحریکات ان مفکرین کو اپنا رہنما کہتی ہیں انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس موقف سے انحراف نہیں کیا۔ اس لیے کسی نظری بحث میں اُلجھے بغیر ہمیں ان ضمنی سوالات پر غور کرنا ہوگا جن پر بہت سے مخلص، دردمند اور اسلام کی سربلندی کے لیے جان کی بازی لگانے والے نوجوان مکمل صورتِ واقعہ کو سامنے نہ رکھنے کے سبب جذبات کی رُو میں بہہ کر عجلت کے ساتھ نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔

پہلی بات یہ طے ہو جانی چاہیے کہ کیا مغربی لادینی اور اباحیت پسند جمہوریت اسلامی نظامِ حکومت کی ضد ہے اور اس کی بنیادیں اسلام کی بنیادوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ بات بھی طے

ہوجانی چاہیے کہ کیا تحریکاتِ اسلامی نے، بشمول جماعت اسلامی پاکستان، کسی موقع پر بھی مغربی لادینی جمہوریت کی تائید کی ہے یا اس کی جگہ نظامِ اسلامی کے قیام کی دعوت اور اس مقصد کے لیے ہرقسم کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا ہے۔ کیا مصر میں حالیہ واقعات میں ہزار ہا افراد کی جانی قربانی، مصر کی 'طاغوتی جمہوریت' کے لیے دی گئی یا خالصتاً اللہ کے دین کے قیام کے لیے یہ قربانیاں دی گئیں۔ کیا اسی اخوان المسلمون نے جوایک وقت زیرزمین سرگرمی کو حکمت عملی کے طور پر صحیح سمجھتی تھی، گذشتہ ۳۰ سال کے عرصے میں جمہوری ذرائع سے جدوجہد کو اختیار نہیں کیا اور حسنی مبارک کے آمرانہ دور میں مصر کی پارلیمنٹ میں دعوتی حکمت عملی اور سیاسۃ شرعیہ کی پیروی کرتے ہوئے شرکت نہیں کی۔ رہا یہ سوال کہ وہ تبدیلی جو وہ چاہتے تھے کہاں تک آئی اور کیا فوجی مداخلت کی بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ جمہوری ذرائع ناکام ہوگئے، ایک الگ بحث ہے۔

دوسری بات یہ بھی طے ہوجانی چاہیے کہ اگر مرض پُرانا ہو اور جراحت اس کا تنہا علاج نہ ہو تو ایک ماہر اور مخلص طبیب ہی یہ طے کرسکتا ہے کہ کس ترتیب کے ساتھ کون سی دوائیں دی جائیں تاکہ مرحلہ بہ مرحلہ مریض صحت یاب ہوتا جائے۔ یہ طے کرنا کہ پھیپھڑے دل یا جگر میں جو خرابی تمام جسم کو فاسد مادوں سے بھر رہی ہے اسے یک دم جراحت کر کے ختم کردیا جائے یا بتدریج ادویات، غذا، ورزش، آب و ہوا کی تبدیلی، عادات کی تبدیلی اور دیگر ذرائع کا استعمال کر کے مریض کو ایک صحت مند انسان بننے میں مدد دی جائے، ایک ماہر طبیب ہی کا کام ہے۔ اس میں بھی شبہہ نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ہی مریض اور ایک ہی مرض کو اگر دو یا تین ڈاکٹر دیکھیں تو ان کی تشخیص میں فرق ہوسکتا ہے۔

لیکن اگر تین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ تمام ممکنہ امتحانات اور جائزے کروانے کے بعد اس پر متفق ہو کہ مریض کا علاج بغیر جراحت کے ہوسکتا ہے اور ایک ڈاکٹر یہ کہے کہ چونکہ مرض مہلک یا طاغوتی نوعیت کا ہے اس لیے پہلے جراحت کرو بعد میں مریض کی قوتِ برداشت، اور دواؤں کے ذریعے صحت مندی کی طرف لاؤ تو اس کی راے اس کے اپنے خیال میں تو درست ہوسکتی ہے لیکن مریض کی جان اور دیگر اطبا کے اجتماعی تجربے کے مقابلے میں کیے گئے فیصلے کے سامنے کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ہاں اس بات کا امکان بہرصورت رہتا ہے کہ کئی ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد مریض

مکمل صحت یاب ہو جائے یا ڈاکٹر اپنی راے تبدیل کر لے۔ اسی طرح بالکل یہ امکان بھی رہتا ہے کہ اگر تنہا ایک ڈاکٹر کی راے پر جراحت کردی جائے تو جراحت کے دوران ہی مریض انتقال کر جائے۔ اس لیے محض امکانات پر فیصلے نہیں کیے جاسکتے۔ ماضی کی تاریخ، اجتماعی تجربے اور طبی حکمت عملی کے پیش نظر ہی دنیا میں صحت کا نظام چل رہا ہے۔

جہاد پر مبنی حکمت عملی

اس روزمرہ کی مثال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ 'تبدیلی صرف جہاد سے آئے گی' کے نعرے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ قرآن وسنت نے اس بات کو واضح کردیا ہے کہ جہاد ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے اور اگر کسی خطے میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو اور انھیں مستضعفین فی الارض بنادیا گیا ہو تو ان کی امداد کرنا اہلِ ایمان پر فرض ہے۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَاوَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا ○ (النساء ۴:۷۵) ''(ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے اُن لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کردیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اُسے ضرور ہم اجرِعظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے''۔

اسی طرح فتنہ اور فساد فی الارض کو دُور کرنے کے لیے بھی اسلامی ریاست کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ○ (البقرہ ۲:۱۹۳) ''تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں، تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں''۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی تمام زندگی ہی جہاد ہے۔ ظلم کے خلاف، نفس کے خلاف اور طاغوت کے خلاف۔

آیاتِ جہاد پر غور کیا جائے تو دو اصول بالکل واضح ہوکر سامنے آتے ہیں: اوّلاً کسی بھی ظالم اور طاغوتی نظام میں محض مظلوم بن کر رہنا، اسلامی فکر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ طاغوتی نظام میں دو ہی راستے ہوسکتے ہیں: اوّلاً: اس کے خلاف جدوجہد کہ اس کی جگہ عدل کا نظام آئے اور اگر تمام تر کوششوں کے بعد صبروتحمل کے ساتھ تمام دعوتی مراحل سے گزرنے کے بعد یہ یقین ہوجائے کہ یہاں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی تو پھر وہاں سے ہجرت۔ اس میں اگر عجلت کی گئی تو وہ غلط ہوگا [حضرت یونسؑ کی مثال ہمارے سامنے رہنی چاہیے]۔ یہی شکل مکہ مکرمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے ثابت ہوتی ہے کہ ۱۳ برس تک ہر ہر آزمایش اور تعذیب سے گزرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی حکم دیا تو ہجرت کی گئی، ورنہ مکہ میں بذریعہ قوت قریش کی حکمرانی کو ختم کردینا بھی ایک امکانی اقدام (option) تھا۔ حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ اور دیگر صحابہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود مشرکین کے سرداروں کو ایک رات میں قتل کر کے اسلامی نظام قائم کرسکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

قرآن کریم نے جان اور مال کے ساتھ جہاد کو افضل قرار دیا ہے اور بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں میدانِ جہاد میں آنے والوں کے لیے اعظم درجے کا وعدہ فرمایا ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا گیا: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًاo (النساء ۴:۹۵) ''مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے، اُن کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔

سو، فساد میں اس بات کو دوٹوک انداز میں واضح کردیا گیا۔ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں،

دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ اعظم و افضل رکھا ہے۔ اگر چہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

جہاد قرآن کریم میں ایک جامع اصطلاح ہے جس میں افضل ترین شکل وہ نہیں ہے جو بعض حضرات ایک ضعیف حدیث کی بنا پر سمجھتے ہیں بلکہ میدانِ عمل میں طاغوتی قوتوں کے خلاف مناسب حکمت عملی اور تیاری کے ساتھ جہاد کرنا قرآن کریم کا مقصود ہے۔ اس جہاد کے بارے میں یہ بات بھی سمجھا دی گئی ہے کہ اگر اہلِ ایمان طاغوتی قوتوں سے عددی لحاظ سے کم بھی ہوں تو وہ اپنے خلوص، اللہ پر اعتماد، صبر اور حکمت عملی کے صحیح ہونے کے سبب کامیاب ہوں گے، چاہے ان کا تناسب ایک اور دس کا ہی کیوں نہ ہو، یعنی اہلِ ایمان ۲۰ ہوں اور طاغوتی قوت ۲۰۰ کے لگ بھگ ہو۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ o (انفال ۸:۶۵) ''اے نبیؐ! مومنوں کو جنگ پر اُبھارو۔ اگر تم میں سے ۲۰ آدمی صابر ہوں تو وہ ۲۰۰ پر غالب آئیں گے اور اگر ۱۰۰ آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے''۔

اسی چیز کو اہلِ ایمان نے بدر میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جب اُحد اور حنین میں حکمت عملی پر صحیح عمل نہ کیا تو دوسری نوعیت کے نتائج سامنے آ کر رہے۔ مکہ مکرمہ میں ۱۳ برس کا عرصہ بھی عرصہ جہاد تھا کہ ہر ہر سطح پر مزاحمت کا سامنا تھا۔ تعذیب تھی، امتحان تھا، ظلم تھا لیکن یہاں جہاد کی ایک خاص شکل تھی اور مدنی دور میں حالات کی تبدیلی کے بعد اس کی دوسری شکلیں سامنے آئیں گی، لہٰذا یہی جہاد مدینہ منورہ میں معاشرے کی تعمیر، عدل کے نظام کے قیام اور اہلِ کتاب کے ساتھ تعلقات کی نوعیت طے کرنے میں میثاقِ مدینہ کی شکل اختیار کر گیا اور پھر بدر، اُحد، خندق، حدیبیہ، تبوک، فتح مکہ، حنین اور خیبر سب ہی جہاد کے مختلف رُخ ہیں۔ گویا جہاد اہلِ ایمان کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن جہاد ہی ہے، جو اُمت مسلمہ کے جسم کو زندہ اور متحرک رکھتا ہے۔

جہاد فرض ہونے کا سوال

جہاد کے میدان کا تعیّن کہ کہاں پر کیا جائے، اور کیا کیا جائے، نیز جہاد کے وقت کا تعیّن کہ کس مرحلے میں کون سی شکل اختیار کی جائے، جہاد کے ہدف کا تعیّن کہ اصل مطلوب کیا ہے۔ ان تمام معاملات میں فیصلہ کن حیثیت محض انسانی عقل کی نہیں ہے بلکہ انسانی عقل کو اسوۂ نبیؐ کی روشنی میں دیکھنا ہوگا کہ کس صورتِ حال میں شارعِ اعظمؐ نے کیا حکمت عملی اختیار فرمائی۔ مکہ سے ہجرت جہاد کی ایک شکل تھی اور پھر مدنی دور کے تمام ہی سال جہاد کے مختلف مراحل کی تیاری اور ان کی انجام دہی کے سال ہیں۔ فتح مکہ جہاد کی ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی کہ خون بہائے بغیر اللہ کی حاکمیت کو قائم کیا گیا، لیکن یہ بھی اس کا ایک پہلو ہے کہ جن پر حق کی قوتوں نے غلبہ حاصل کیا ہے، ان سے کیسے معاملہ کیا جائے، یعنی یہ طے کرنا کہ مکہ میں کن مشرکین کو قتل کرنا ہے اور کن کو ان کی ساری زیادتیوں کے باوجود معافی دے کر ان کے دلوں کو فتح کر لینا ہے۔ یہ سب کچھ اسوۂ حسنہ ہی تو ہے، جس پر غور کیے بغیر جہاد کا مقام، جہاد کا وقت اور جہاد کی حکمت عملی طے نہیں ہوسکتی۔ حدیبیہ کے موقع پر جانوں کی قربانی کرنے کا عہد جہاد ہی تھا لیکن اس کے باوجود بظاہر دشمن کے حق میں ہونے والی شرائط پر معاہدہ کرنا بھی جہاد کی حکمت عملی تھا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ شارع اعظمؐ کی نگاہ جن نتائج کو دیکھ رہی تھی ان تک فاروق اعظمؓ تک کی نگاہ اس خاص لمحے نہ پہنچ سکی۔ نہ یہ ان کے ایمان کی کمزوری تھی نہ فراست میں کمی۔ اصل چیز منہجِ نبوت کی اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ، تعلیم اور تعیین تھی اور اس منہج میں یہ تمام پہلو قوسِ قزح کی طرح ہمیشہ کے لیے موجود ہیں اور رہیں گے۔

جہاد کے حوالے سے ایک اہم سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اس کا اعلان کون اور کب کرے گا؟ امام ابن تیمیہؒ اور دیگر علماے کرام کا اس پر اجماع ہے کہ چونکہ یہ ایک اسٹرے ٹیجک معاملہ ہے کہ اس میں اُمت مسلمہ کی جان اور مال دونوں کا دخل ہے اس لیے یہ فیصلہ ذمہ داری اور عواقب پر غور کے بعد کیا جائے گا۔ اور یہ مسلمان حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرے۔ استثنا کی شکل میں یہ کام ان علما کا ہے جو کسی سیاسی یا معاشی مفاد کے زیراثر یہ کام نہ کریں بلکہ اُمت مسلمہ کے مفاد اور مصلحت عامہ کے اصول پر غیر جذباتی طور پر غور کرنے کے بعد کریں

جیسا کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور حضرت سیّداحمداورشاہ اسماعیل شہید نے تحریکِ مجاہدین کا آغاز کیا۔

لیکن کسی مسلم ریاست کے خلاف خروج اور خود مسلمانوں کے خون کو حلال کر لینا اس سے بہت مختلف معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ محض اس قیاس پر نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ حکومت کے فلاں ذمہ دار نے کسی بیرونی قوت سے ایک understanding یا ایک خفیہ معاہدہ کرلیا ہے، اس لیے اس سے وابستہ کسی بھی فرد کو جہاں کہیں چاہیں ہلاک کردیں۔ اس کی گنجایش دین اسلام میں نہیں ہے۔اس سلسلے میں سب سے نمایاں مثال خوارج کی ہے۔

خوارج کی فکری غلطی

خوارج نے اپنی فکری غلطی کی بنا پر یہ سمجھ لیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ نے بجاے براہِ راست قرآن کو حکم بنانے کے دونمایندوں کے سپرد یہ کام کردیا کہ وہ قرآن کی روشنی میں طے کریں کہ مسئلے کا حل کیا ہو۔ اس لیے یہ دونوں حضرات خوارج کی نگاہ میں کفراور شرک کے مرتکب ہوگئے۔ چنانچہ ان کا خون ان کے لیے حلال ہوگیا۔اس بنا پر خوارج نے یہ طے کیا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو جہاں کہیں وہ پائے جائیں قتل کیا جائے اور ان کے ساتھ جولوگ شامل ہوں وہ بھی قتل ہوں۔اُمت مسلمہ کی تاریخ گواہ ہے کہ خوارج کی اس فکر کو اجماعی طور پر رد کیا گیا اور انھیں ایک گمراہ فرقہ قرار دیا گیا۔ گو،ان میں سے بہت سے افراد وہ تھے جودن میں حضرت علیؓ کے خلاف جنگ کرتے تھے، راتوں کو تہجد اور قرآن سے رشتہ جوڑتے تھے۔ان کے چہروں پر محرابیں تھیں اور وہ قرآن کے حافظ تھے۔فکری غلطی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص غیر مخلص اور دھوکے باز ہو۔ انتہائی خلوصِ نیت کے ساتھ اور دین کا جامع تصور نہ ہونے کے سبب اللہ کا ایک بندہ فکری غلطی کا مرتکب ہوسکتا ہے۔

جو چیز دیکھنے اور سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنی جان کے دشمن افراد کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کی اور کیا آپ کا یہ کرنا اسلام تھا یا اسلام سے انحراف! آپؓ نے حکم دیا کہ اگر وہ حملہ کریں تو جواب دیا جائے گا کہ جان کا تحفظ کرنا دین کا اصول ہے،لیکن ان کا پیچھا نہ کیا جائے، نہ انھیں غلام بنایا جائے نہ ان کی املاک پر قبضہ کیا جائے، جب کہ وہ کھلی بغاوت کے مرتکب تھے۔

دین کسی ایک پہلو کا نام نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر ہر پہلو کو سمجھ کر حکمت عملی وضع کرنے کا نام ہے۔

جس طرح خوارج نے یہ فیصلہ کرلیا کہ حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو فیصلہ کرنے پر مامور کرنا شرک اور کفر تھا، قرآن کے حکم ماننے کا انکار تھا، ایسے ہی بہت سے سادہ لوح افراد دین کے نام پر خلوصِ نیت کے ساتھ یہ عاجلانہ فیصلہ کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کسی نے نام نہاد طاغوت کے کسی نمایندے سے بات کرلی، مصافحہ کرلیا، کسی ایسے اجتماع میں یا کانفرنس میں شرکت کرلی جس میں طاغوتی نمایندے موجود ہوں تو وہ شرک اور کفر کا مرتکب ہوگیا، اس لیے واجب القتل ہوا۔ اس قسم کی منطق اختیار کرنے سے قبل دین اسلام کے مقصد و مدعا، نبی کریمؐ کے اسوہ اور حکمت عملی کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں ذمہ دارانہ اور اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس کے ساتھ حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ فیصلے جذباتی انداز میں نہیں کیے جاسکتے۔

خوارج اور اس طرح کے افراد نے جو شکل اختیار کی، اُمت کی تاریخ نے اس پر کیا فیصلہ دیا، یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اُمت نے جس چیز کو اسوہ نبویؐ کے مطابق سمجھا وہ خوارج کی فکر نہ تھی بلکہ بتدریج، مرحلہ بہ مرحلہ، صبرواستقامت اور قربانی کے ساتھ دعوتی کام کرتے رہنا، وقت کے لحاظ سے موجود ذرائع ابلاغ کا استعمال کرنا اور وقت کی قید سے بے پروا ہوکر اپنی تمام قوت اللہ کے دین کے قیام کے لیے لگا دینے ہی کو سواء السبیل قرار دیا۔

یہ بات بھی سامنے رہنی چاہیے کہ دین میں شرعی احکام کا نفاذ صرف اور صرف ظاہر پر ہے باطن پر نہیں۔ یہی سبب ہے کہ مدینہ منورہ میں منافقین کی کھلی اور چھپی ہوئی سرگرمیوں کے باوجود نبی کریمؐ نے منافقین کے قتل کا حکم نہیں دیا، جب کہ وہ اہلِ مکہ کے ساتھ خفیہ سازشوں میں شریک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اور سنت مطہرہ نے انسانی جان کی حُرمت کو جو مقام دیا ہے ہم اُس سے بہت دُور نکل چکے ہیں۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ نبی کریمؐ کو بہت عزیز تھے لیکن جب حضرت اسامہ نے ایک شخص کو دورانِ جنگ یہ کہنے کے باوجود کہ وہ ایمان لاتا ہے قتل کر دیا تو نبی رحمتؐ نے اس پر سخت غصّے کا اظہار فرمایا اور اسامہ سے پوچھا کہ کیا انھوں نے اس کے دل کو چیر کر دیکھا تھا کہ اس میں ایمان تھا یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ دل سے مسلمان ہوا تھا یا دکھانے اور جان بچانے کے لیے! اس لیے کسی کی تکفیر کر دینا اور مشرک قرار دے کر اس کے خون کو حلال کرلینا نہ

قرآن سے ثابت ہے اور نہ سنت سے۔ خوارج کا بھی عجیب معاملہ تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو تو وہ قتل کے لائق سمجھتے تھے لیکن ذمیوں پر جو غیر مسلم تھے، اس بنا پر کہ ان کی جان کا ذمہ اللہ اور رسولؐ نے لیا تھا، ہاتھ اُٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ فہم کی غلطی انسان کو کہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتا ہے اور اس پر نازاں بھی ہوتا ہے کہ اصل اسلام پر وہ عمل کر رہا ہے۔ خوارج خلوصِ نیت سے یقین رکھتے تھے کہ وہ حق پر ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا یہ تہجد گزار اور قرآن کے حافظ تھے اس کے باوجود فکر کی غلطی نے انھیں گمراہ کر دیا۔

اسلامی نظامِ حکومت میں دستور اور قانون کی تدوین کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ قرآن وسنت کو دستور مان لینے کے بعد نہ کسی مزید دستور کی ضرورت ہے نہ کسی قانون کی۔ اسلام کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ قرآن وسنت کا دوسرا نام شریعت ہے اور شریعت نے جو حدود متعین کر دی ہیں انھیں دنیا کے تمام مسلمان مل کر بھی تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن جن معاملات کے بارے میں قرآن وسنت میں واضح ہدایت موجود نہ ہو، ان کا کیا کیا جائے۔ ظاہر ہے کوئی نئی وحی تو آ نہیں سکتی۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ فلاں معاملے میں اس پر یہ وحی آئی ہے۔ جو ایسا کرے گا وہ اللہ اور رسولؐ اللہ پر جھوٹ باندھے گا۔

اختلاف راے اور اجتہاد

اس کا حل خود قرآن کریم اور سنت رسولؐ نے یہ بتایا کہ ایسے تمام معاملات میں اجتہاد، قیاس اور اجماع پر عمل کیا جائے گا لیکن اس پورے عمل میں اسلامی نظامِ حکومت کی اصل روح مشاوت کا کرنا ہے، حتیٰ کہ دورِ نبویؐ میں بھی بہت سے اہم معاملات مشاورت کے بعد طے کیے گئے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ نبی کریمؐ اپنی فراست اور وحی الٰہی کے جاری رہنے کی بنا پر اگر چاہتے تو بغیر کسی سے پوچھے فیصلے فرما سکتے تھے اور آپؐ کا ہر فیصلہ صحابہؓ کے لیے قابلِ قبول ہوتا لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا تا کہ آپؐ کی اُمت اسلامی نظم مملکت کے اس اصول کو عملاً دیکھ کر اس کی اہمیّت سے آگاہ ہو سکے۔ غزوۂ بدر میں میدان کے انتخاب کا معاملہ ہو یا اُحد کے موقع پر مدینہ منورہ میں ٹھیر کر مقابلہ یا باہر نکل کر مقابلہ، غزوۂ احزاب میں دفاعی حکمت عملی ہو یا احزاب کے بعد یہود کے ساتھ طرزِ عمل کا سوال، ہر اہم معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ کو نہ صرف قائم کیا بلکہ اس

کی رائے کا پورا احترام فرمایا۔

آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے معاملے میں اور اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کی روانگی کے سلسلے میں جو فیصلے کیے، انھیں معلومات نہ ہونے کی بنا پر بعض حضرات ان کا veto کرنا کہتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ پہلے معاملے میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس دلیل اپنی رائے کی نہیں تھی بلکہ قرآن میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی یکساں مرکزیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صحیح احادیث کی تھی جن کے واضح الفاظ کی پیروی میں انھوں نے یہ اقدام کیا۔ چنانچہ آپ نے نبی کریمؐ کا ارشاد سنایا کہ: ''مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کریں۔ جب وہ اقرار کرلیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال میری طرف سے محفوظ ہوجائیں گے، مگر اس کلمہ کے کسی حق کے تحت اور ان کے باطن کا محاسبہ اللہ کے ذمے ہے''۔ دوسری حدیث جو آپؐ نے بیان فرمائی اس کے الفاظ بھی بہت اہم ہیں: ''مجھے حکم ملا ہے کہ مَیں تین چیزوں پر لوگوں سے جنگ کروں: کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت پر، نماز قائم کرنے پر اور زکوٰۃ کی ادایگی پر''۔

ان احادیث کے دلیل قطعی ہونے کی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ کرنا دلیلِ شرعی اور واضح نص پر تھا۔ یہاں معاملہ شوریٰ کے دائرے سے باہر تھا۔ قرآن وسنت کے نصوص کی موجودگی میں خلیفہ کا کام صرف ان احکام کا نفاذ تھا۔ مشاورت کس بات پر کی جاتی ؟

اسی طرح جس لشکر کو تیار کروانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے علَم حوالے کیا ہو، کیا اسے روکنا رسول اللہ کی اطاعت تھی یا اسے آپ کی منشا کے مطابق روانہ کرنا ادایگی فرض تھا۔ یہاں بھی معاملہ نہ شوریٰ کا تھا نہ اکثریت یا اقلیت کا۔

یہ خیال کہ خلیفہ صرف اللہ کو جواب دہ ہے قرآن وسنت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ شوریٰ اور مشاورت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد ان کے خلفا اپنے تمام اُمور میں مشاورت کریں اور مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد جس رائے پر اکثریت کا اتفاق ہو اسے نافذ کیا جائے۔ شوریٰ کا مقصد محض نمایشی طور پر تفنن طبع کے لیے لوگوں کی رائے معلوم کرنا نہیں ہے کہ تمام بحث ومباحثے کے بعد کرے وہی جو خلیفہ خود چاہتا ہو۔ (جاری)

امریکی جمہوریت
بین الاقوامی قانون، شخصی آزادی اور نجی زندگی کے
تحفظ کے لیے خطرہ

عبداللہ فیضی

امریکا اس وقت معاشی، سیاسی اور فوجی اعتبار سے دنیا کا طاقت ور ترین ملک ہے۔ عالمی طاقت ہونے کے ناتے جمہوریت، قانون کی بالادستی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے بھی خود کو پوری دنیا کے لیے نمونہ سمجھتا ہے اور اسی وجہ سے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کبھی تو انسانی حقوق اور کبھی جمہوریت کے نام پر دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کو اپنا جائز حق سمجھتا ہے۔ لیکن درحقیقت انسانی حقوق اور جمہوری روایات کے حوالے سے امریکا کی اپنی تاریخ خاصی تلخ واقع ہوئی ہے۔ وکی لیکس اور اب ایڈورڈ سنوڈن کے انکشافات نے نہ صرف اس نقاب سے پردہ اٹھایا ہے بلکہ اُن کے پیچھے چھپے امریکا کے اصل توسیع پسندانہ عزائم کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ امریکا میں نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے سابق خفیہ اہل کار ایڈورڈ سنوڈن کے ہاتھوں افشا ہونے والے جاسوسی پروگرام 'پرزم' کی تفصیلات سے متعلقہ معلومات پر جاری گرما گرم بحث اب ایک باقاعدہ قانونی جنگ کی صورت اختیار کر رہی ہے۔

امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کی ۴جنوری ۲۰۱۳ء کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق امریکی حکومت نے نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے خفیہ پروگرام 'پرزم' کے خلاف آنے والے ۱۶دسمبر ۲۰۱۳ء کے عدالتی فیصلے کے خلاف اپیل کا فیصلہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے ایک امریکی شہری لینی کلے مین نے امریکی وفاقی ضلعی عدالت میں پرائیویسی قوانین کی خلاف ورزی کو جواز بناتے

ہوئے ایک مقدمہ Klayman v. Obama دائر کیا تھا۔ ۱۶دسمبر ۲۰۱۳ء کو مذکورہ مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے وفاقی عدالت کے جج ریچرڈ لیون نے نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے خفیہ پروگرام 'پرزم' کو امریکی آئین کی چوتھی ترمیم جس میں Privacy Rights کا تحفظ کیا گیا ہے، سے متصادم قرار دیتے ہوئے نہ صرف غیرآئینی بلکہ فلاحی ریاست کے لیے تباہ کن قرار دیا اور مذکورہ پروگرام کو بند کرنے کا حکم جاری کیا۔ بعدازاں ۲۷دسمبر کو اسی سلسلے کے ایک اور مقدمے ACLU v. Clapper میں ایک دوسرے وفاقی جج ولیم پویلے نے حکومتی عذر کو تسلیم کرتے ہوئے مذکورہ پروگرام جاری رکھنے کی اجازت دی۔

ان دونوں مقدمات میں ہونے والی بحث اور قانونی نکات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلّق اہم واقعات اور دیگر پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ حالیہ بحث کا آغاز اس وقت ہوا جب برطانوی اخبار دی گارڈین نے اپنی ۷جون ۲۰۱۳ء کی رپورٹ میں نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے سابق خفیہ اہل کار ایڈورڈ سنوڈن کے حوالے سے انتہائی اہم نوعیت کی خفیہ معلومات افشا کیں۔ اس رپورٹ کے مطابق نیشنل سیکیورٹی ایجنسی نے گوگل، سکائپ، مائیکروسافٹ، یوٹیوب، یاہو، فیس بک اور ایپل کے پاس موجود دنیا بھر کے صارفین کی ذاتی معلومات تک رسائی حاصل کی اور انھیں جمع کیا۔ جمع کی جانے والی معلومات میں ان کمپنیوں کے صارفین کی نجی معلومات، ای میل، چٹینگ اور فون ریکارڈ خفیہ طور پر سنا اور اکٹھا کیا جاتا تھا۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق یہ حساس اور ذاتی نوعیت کا ڈیٹا حاصل کرنے کے لیے نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کو انٹرنیٹ کمپنیوں کے سرورز تک رسائی حاصل تھی جنھیں بیک ڈور چینلز کا نام دیا گیا۔ یہاں سے صارفین کی تمام تر معلومات بلاواسطہ نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے کمپیوٹرز تک پہنچ جاتی تھیں، جب کہ مشہور سماجی رابطے کی ویب سائٹ فیس بک کے صارفین کے ڈیٹا تک رسائی کے لیے نیشنل سیکیورٹی ایجنسی نے فیس بک کا جعلی سرور بھی بنایا جس پر فیس بک کے سربراہ مارک زبرگ نے مایوسی کا اظہار کیا۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ ۲۰۱۲ء میں ۲۰۱۱ء کی نسبت سکائپ سے حاصل کی جانے والی معلومات میں ۲۴۸ فی صد، فیس بک سے ۱۳۱ فی صد اور گوگل سے ۶۳ فی صد معلومات میں اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔

دی گارڈین کی رپورٹ کے مطابق ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے افشا کردہ کل ۵۸ ہزار

دستاویزات میں سے اخبار نے اب تک بہت کم تفصیلات عام کی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق نیشنل سیکیورٹی ایجنسی نے تقریباً ۲۷ ٹیرا بائٹ کی مقدار تک معلومات حاصل کی تھیں۔ یہ مقدار اتنی بڑی تھی کہ خود نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کو بھی اس کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا، جب کہ یہ عمل ایک کمپیوٹر سسٹم 'ٹریولر' کی مدد سے کیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ۳ مارچ کو شائع کردہ دی گارڈین کے مضمون میں برطانوی نائب وزیر اعظم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ۲۰۱۳ء کے صرف ۱۰ منٹ میں پوری دنیا کے انٹرنیٹ صارفین کی جانب سے پیدا کردہ معلومات/ ڈیٹا کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ جتنی تاریخ کی ابتدا سے لے کر ۲۰۰۲ء تک کے ڈیٹا/معلومات کی تھی۔ اس امر سے اس بات کا اندازہ بھی خوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ٹکنالوجی کی ترقی اور دنیا کے عالمی گاؤں بن جانے سے معلومات کے بہاؤ میں کس حیران کن حد تک تیزی اور تبدیلی آچکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بی بی سی کی ۷ مارچ کی شائع کردہ رپورٹ میں امریکی فوج کے اعلیٰ اہل کار کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے افشا کردہ معلومات کی مقدار کے تعیّن اور اس سے ہونے والے نقصانات کے تدارک کے لیے بھی دو سال کا عرصہ درکار ہے۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے اس جاسوسی پروگرام کی نوعیت پہلے سے موجود منصوبوں سے خاصی سنگین ہے اور یہ انٹرنیٹ صارفین کی ذاتی زندگیوں پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ امریکی قانون میں امریکی شہری کے خلاف کی جانے والی اس قسم کی جاسوسی سے پہلے متعلقہ عدالت کے جج سے منظوری لینا لازمی ہے لیکن 'پرزم' کے تحت کی جانے والی الیکٹرانک جاسوسی کے لیے ایسی کوئی بھی منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی۔ مزید یہ کہ یہ تمام سرگرمیاں امریکی Privacy Laws کے بھی خلاف تھی جو کہ امریکی آئین میں شامل چوتھی ترمیم کے تحت تمام شہریوں کو Unreasonable Search سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی ملک کو اپنی قومی سلامتی اور ملکی دفاع کے حوالے سے اقدامات کرنے کا حق تو حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فرد کی نجی زندگی اور بین الاقوامی اور ملکی قوانین کی مکمل پاس داری بھی نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایڈورڈ سنوڈن جو کہ اس وقت روس میں عارضی پناہ لیے

ہوئے ہیں، کے مطابق انھوں نے یہ راز امریکی عوام کے مفاد اور ریاست کی جانب سے عوام کی آزادی اور انفرادی زندگیوں میں مداخلت کے خلاف اٹھائے تاکہ امریکی شہریوں کی آزادی کا تحفظ کیا جاسکے۔ ان کے اس اقدام نے انھیں امریکی اور دنیا بھر کے عوام کی نظروں میں ایک ہیرو بنادیا، جب کہ امریکی حکومت نے انھیں مجرم قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف مقدمہ چلانے اور روس سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا جسے روسی حکومت نے رد کر دیا۔

نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کی جانب سے کی جانے والی جاسوسی کا سلسلہ یہیں نہیں رکا بلکہ دی گارڈین ہی کی ایک اور رپورٹ (شائع شدہ ۲۵/اکتوبر ۲۰۱۳ء) کے مطابق امریکا نے دنیا بھر کے ۳۵ سربراہان مملکت کے استعمال میں موجود موبائل فونز اور ای میلز کی بھی نگرانی کی۔ رپورٹ کے مطابق ایک امریکی اہل کار نے نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کو ۲۰۰ مشہور شخصیات کے فون نمبروں کی لسٹ فراہم کی جن کی جاسوسی کرنے کو کہا گیا۔ ان شخصیات میں ۳۵ سربراہان مملکت کے فون نمبر بھی شامل تھے۔ جن سربراہان مملکت کے فون ریکارڈ کیے گئے ان میں برازیل، میکسکو اور کیوبا کے ساتھ ساتھ امریکا کے دوست اور اتحادی ملک جرمنی کی چانسلر اینجیلا مرکل کا فون ٹیپ کرنا بھی شامل تھا۔

اس رپورٹ کے افشا ہونے کے بعد امریکا اور یورپین یونین کے تعلقات میں شدید سفارتی تناؤ پیدا ہوا جس کو برسلز میں ہونے والے یورپی سربراہ کانفرنس ۲۰۱۳ء کے موقع پر اینجیلا مرکل کی طرف سے اعتماد کا مجروح ہونا قرار دیا کہا گیا۔ اس قسم کی جاسوسی کے بعد امریکا کو یورپی یونین اور دیگر ممالک کی طرف سے بھی شدید تنقید اور مذمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس تمام صورت حال پر سب سے زیادہ شدید اور سخت ردعمل برازیل کی طرف سے دیا گیا جہاں برازیل کی صدر ڈلما رسل نے دسمبر ۲۰۱۳ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خطاب میں امریکا کے اس اقدام کی شدید مذمت کی اور اسے بین الاقوامی قانون کی کھلی خلاف ورزی قرار دیا اور خطاب کے بعد اپنی پہلے سے طے شدہ ملاقات جو کہ برازیلی صدر اور اوباما کے مابین ہونا تھی کو منسوخ کرتے ہوئے وطن واپس چلی آئیں۔

ایک اور رپورٹ کے مطابق جو نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کی انٹرنل آڈٹ رپورٹ کا حصّہ ہے، خود نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے اندرونی حلقوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ۲۰۰۸ء کے بعد سے کانگریس سے ملنے والے اختیارات کو ناجائز استعمال کرتے ہوئے نیشنل سیکیورٹی ایجنسی نے ہر سال

ہزاروں کی تعداد میں Privacy Laws کی خلاف ورزیاں کی ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۱ء میں Foreign Intelligence Surveilliance Act کی ۱۵۰ بار اور صدارتی ایگزیکٹو آرڈر کی ۳۰۰ بار خلاف ورزی کی ہے۔

'پرزم' کے اس پروگرام کے تحت امریکی شہریوں اور سربراہان مملکت کے علاوہ باقی تمام دنیا بھر کے افراد اور اداروں کی جاسوسی بھی کی گئی، حتیٰ کہ بڑی کاروباری کمپنیاں اور آئل ریفائنریز تک بھی جاسوسی کے اس جال سے بچ نہ سکیں۔ جس بڑے پیمانے پر یہ جاسوسی کی گئی اس کا اندازہ ۱۳ جنوری ۲۰۱۴ء کو جاری کردہ وہ بی بی سی کی رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق روزانہ دنیا بھر سے ارسال کردہ ۲۰۰ ملین موبائل فون ایس ایم ایس پیغامات کا معائنہ نیشنل سیکیورٹی ایجنسی میں کیا جاتا ہے، جب کہ ۱۵ ارارب موبائلز کے محل وقوع کے بارے میں معلومات بھی حاصل کی جاتی ہیں۔

یہاں یہ بات معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ عدالت میں دورانِ سماعت یہ بات بھی سامنے آئی کہ جس 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' اور نیشنل سیکیورٹی کی آڑ میں یہ تمام جاسوسی کی جاتی ہے، اس کے لیے اس تمام عرصے کے دوران اس ذریعے سے حاصل کردہ معلومات کی وجہ سے ایک بھی دہشت گرد یا دہشت گردی کا منصوبہ نہیں پکڑا جا سکا۔ نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے خفیہ پروگرام 'پرزم' سے متعلّق سب سے اہم اور تشویش ناک معلومات پاکستان کے متعلّق دریافت ہوئی ہیں۔ ایڈورڈ سنوڈن کی جانب سے پاکستان کے متعلّق فراہم کردہ معلومات جو برطانوی اخبار دی گارڈین میں ۱۱ جون ۲۰۱۳ء کو Boundless Informant کے عنوان سے اور پاکستانی انگریزی روزنامے دی ایکسپریس ٹریبون کی ۹ جون ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہیں کے مطابق دنیا بھر میں جاسوسی کی بنیاد پر حاصل کردہ ڈیٹا کے اعتبار سے پاکستان دوسرے نمبر پر ہے، یعنی نیشنل سیکیورٹی ایجنسی نے سب سے زیادہ جاسوسی جن ممالک کی کی، پاکستان ان میں دوسرے نمبر پر ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۳ء میں صرف مارچ کے مہینے میں سب سے زیادہ ڈیٹا ایران سے حاصل کیا گیا جو کہ ۱۴ بلین، انٹیلی جنس رپورٹس پر مشتمل تھا اور دوسرے نمبر پر مارچ ہی کے مہینے میں پاکستان سے ۱۳ء۵ بلین، انٹیلی جنس رپورٹس حاصل کی گئیں۔ مذکورہ رپورٹ پڑھ کر یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ پاکستانی شہریوں اور اہم شخصیات کی جاسوسی بہت بڑے پیمانے پر کی جارہی ہے، یعنی ہمارا

ایس ایم ایس، ای میل اور دیگر ذاتی اور حساس نوعیت کا ڈیٹا مسلسل نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے پاس جمع ہو رہا ہے۔

اسی سلسلے میں پاکستان کے حوالے سے امریکی عزائم افشا کرتی ایک اور نہایت اہم دستاویز NSA Black Budget Summary ہے۔ یہ دستاویز امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کی ۲۹/اگست ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں افشا کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے ۲۰۱۳ء کے لیے ۵۲ء۶ بلین ڈالر کے خطیر بجٹ اور اس کے مصارف بیان کیے گئے ہیں۔ قابلِ ذکر اور باعثِ تشویش بات یہ ہے کہ نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے اس بجٹ میں پاکستان میں جاسوسی سرگرمیوں کے لیے بڑا حصّہ رکھا گیا ہے۔ رپورٹ کا سب سے افسوس ناک اور چشم کشا پہلو یہ ہے کہ اس میں پاکستان کو جو کہ کسی زمانے میں غیر ناٹو حلیف تھا، اب ایک مشکل سے قابو آنے والا ہدف قرار دیا گیا ہے۔ یہ چشم کشا اور حقائق پر مبنی معلومات نہ صرف امریکا کی پاکستان دشمنی کی غماز ہیں بلکہ ان تمام محبّ وطن حلقوں کے شبہات کو بھی تقویت دیتی ہیں جو پاکستان کی سلامتی اور داخلی امور کے حوالے سے امریکا کے مشکوک کردار پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان رپورٹس کے بعد پاکستان امریکا سے جواب طلب کرتا لیکن افسوس کہ ہمارے دفتر خارجہ کی طرف سے ایک رسمی بیان تک نہ جاری ہو سکا۔ فراہم کردہ معلومات، ماضی کے کردار اور امریکا کی طرف سے عالمی قوانین کی پامالی کے حوالے سے ایک طویل تاریخ کے تناظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکا جو اس وقت طاقت کے نشے میں بدمست ہے دنیا کے کسی بھی قانون اور ضابطے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے صرف 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کے فلسفے پر کاربند ہے۔ نیشنل سیکیورٹی اور نام نہاد 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کی آڑ میں اپنے استعماری ایجنڈے کو پوری دنیا پر بزور طاقت نافذ کرنے کے درپے ہے اور اس کے لیے ہر حد سے گزرنے کو تیار ہے۔ بدقسمتی سے مسلم دنیا کی قیادت اس ایجنڈے کے آگے بند باندھنے اور اس کا توڑ کرنے سے قطعی قاصر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے مسلم ممالک اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود امریکا کو آئینہ دکھانا تو دور کی بات اپنے ہی حق کے لیے بھی آواز بلند نہیں کر پا رہے۔

پاکستان جو غیر ناٹو حلیف کے درجے سے ترقی پا کر آج ہدف کی منزل تک پہنچ چکا ہے، اس کے حکمرانوں کو بھی اب ہوش کے ناخن لینا ہوں گے۔ امریکا کے ساتھ تعاون کی پالیسی اور

امریکی جنگ میں شمولیت کے ثمرات آج پاکستان کے طول وعرض میں نظر آنے لگے ہیں۔ بلوچستان اور کراچی عالمی طاقتوں کے کھیل کے میدان، جب کہ قبائلی علاقہ جات ہماری اپنی عاقبت نااندیشی کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ اب امریکا جو کہ عالمی قوانین اور انسانی حقوق کا علَم بردار بنا بیٹھا ہے اس کا حقیقی چہرہ دکھایا جائے اور دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ جو دراصل امریکی ایجنڈے اور توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل ہے، سے باہر نکلا جائے اور اس بات پر غور کیا جائے کہ امریکا کا ساتھ دے کر ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟

حالیہ بحث اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ردِعمل سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس حوالے سے تین نکات بہت اہمیّت کے حامل ہیں جن کو حل کرنا دنیا کے تحفظ کے لیے اور خود امریکا کے اپنے تشخص کے لیے بے حد ضروری ہے:

۱- قومی سلامتی کے اداروں کے طریقہ کار اور فرد کی پرائیویسی کے تحفظ کے درمیان توازن، معلومات تک رسائی کے حوالے سے موجودہ قوانین کا ازسرِنو جائزہ اور خودکار احتسابی نظام کی تشکیل۔

۲- اختیارات کے ناجائز استعمال اور فرد کی ذاتی معلومات کے مجروح ہونے کی صورت میں قانونی ضمانت، جب کہ دوسرے ملکوں کی آزادی اور سلامتی کی ضمانت کے سلسلے میں بین الاقوامی قوانین کی مکمل اور بلاامتیاز پاس داری۔

۳- صرف اسلامی ہی نہیں بلکہ انسانی نقطۂ نگاہ سے ٹکنالوجی سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں اور تمام مذاہب، رنگ ونسل اور اقوام کی عزت و ناموس کے حوالے سے مؤثر قانون سازی اور ضابطۂ اخلاق بھی وقت کی اہم ضرورت ہے، تاکہ نہ صرف فرد کی آزادی کا تحفظ یقینی بنایا جاسکے بلکہ ادیانِ عالم اور اقوام کی عزت وناموس اور سلامتی کا بھی پاس رکھا جاسکے۔

ہماری نظر میں مؤثر قانون سازی کے بغیر یہ مسئلہ ایک گمبھیر صورت حال اختیار کرتے ہوئے اب عالمی مسئلے کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ لہٰذا تمام اقوام کو متحد ہوکر اقوام متحدہ کی سطح پر اس مسئلے کے تدارک کے لیے مؤثر اقدامات اٹھانے چاہییں، تاکہ یہ دنیا رہنے کے لیے ایک بہتر جگہ بن سکے جہاں تمام اقوام امن، عزت اور برابری کے حقوق کے تحت مل جل کر جینے کا حق پاسکیں۔

مضمون نگار انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد میں ریسرچ اسسٹنٹ ہیں

ذہن کی کایا پلٹ دینے والی کتاب

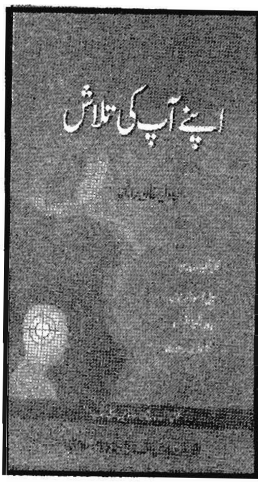
☆ وقتِ پیدائش سے لمحۂ آخر تک زندگی کی میراتھن کو اگر ایک لفظ میں سمویا جائے، تو وہ لفظ ''تلاش'' ہے

☆ کائنات کے نظام اور اس کی ورکنگ کو اگر ایک لفظ میں سمیٹا جائے، تو وہ ''حرکت'' ہے

☆ شعور ذات کا مسئلہ ہو۔ شعور کائنات یا شعور خدا کے حصول کا چیلنج ہو، وہ ایک لفظ ''جستجو'' کا مرہون منت ہے

اور اگر مذکورہ تینوں لفظوں کو سمو کر انہیں کتاب کا موضوع بنایا جائے، تو اس کا عنوان بنتا ہے

''اپنے آپ کی تلاش''



انسان کے لئے سب سے بڑا چیلنج اپنی ذات سے آگاہی ہے۔ اسی سے وابستہ بہت سے وہ سوالات ہیں، جن کا روزمرہ کی زندگی میں ٹھیک آپ کی مثبت اور منفی سوچ، کامیابی اور ناکامی، خوشی اور غمی اور ترقی اور تنزلی سے براہ راست تعلق ہے ''اپنے آپ کی تلاش'' میں انہی اشوز کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سینئر صحافی اور متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف سجاول خان رانجھا کی مرتب کردہ دنیا بھر کے بہترین دماغوں کے فکر انگیز خیالات، سبق آموز کہانیوں، ولولہ انگیز اقوال اور فکر افروز سوالات سے مزین 300 صفحات پر مشتمل کتاب، جو آپ کی زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دے گی

قیمت مع ڈاک خرچ.......450 روپے

مزید معلومات کے لئے کسی بھی وقت ذیل کے ایڈریس، فون یا موبائل نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں

اقدار ملت ہاؤس آف نالج اینڈ وزڈم، مکان نمبر 2126 گلی نمبر 33 آئی ٹن ٹو اسلام آباد

فون نمبر 051-4448590 موبائل: 0321-5007973 ای میل ایڈریس: aqdaremillat2@gmail.com

نظریۂ ارتقا اور اس کی درمیانی کڑی
—— 'پلٹ ڈاؤن مین'

رضی الدین سیّد

برطانوی مفکر 'چارلس رابرٹ ڈارون (۱۸۰۹ء-۱۸۲۲ء) ، ایک ڈاکٹر کا بیٹا اور ایک بایالوجسٹ تھا، اور خوش حال خاندان سے تعلّق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دور میں نظریۂ ارتقا پر ایک کتاب On the Origin of Species تحریر کی تھی جس میں اس نے اپنی تحقیقات سے ثابت کیا تھا کہ ہر جان دار نے درجہ بدرجہ ترقی کر کے ہی اپنی موجودہ اصلی شکل اختیار کی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ، مثلاً زرافے نے اپنی موجودہ گردن اونچی اونچی شاخوں سے غذا حاصل کرنے کے لیے ہی رفتہ رفتہ لمبی کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ انسان نے بھی درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے ہی اپنی موجودہ انسانی شکل اختیار کی ہے۔ اس کے نزدیک بندر (چیمپینزی) نے پہلے پہل اپنے اگلے دونوں پاؤں اُوپر اٹھائے تھے، جھکی ہوئی حالت میں زندگی گزارنے کے قابل ہوا تھا، اور پھر رفتہ رفتہ اس کے جسم کے گھنے بال کم ہونے شروع ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہی سے اس میں عقل کی نشو ونما بھی ہونے لگی تھی۔ چنانچہ قطعی حتمیت کے ساتھ اس کا کہنا ہے کہ انسان کے آباؤ اجداد اپنی اصل میں بندر تھے۔ وہ زور دیتا ہے کہ انسان پہلے 'انسان نما بندر'، پھر 'بندر نما انسان'، اور پھر آخر کار 'مکمل انسان' بن سکا ہے۔

ڈارون کے اس انکشاف نے سائنس دانوں کی ایک بڑی تعداد کو گویا ہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ اس پر بلا تردّد ایمان رکھنے لگے۔ حیرت انگیز طور پر آج کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ یہودی، ربی، 'بنجامن بلیچ'، بھی اس کے نظریے کی تائید کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ ''ہمیں تورات کی جانب دیکھنا چاہیے کہ وہ اس ضمن میں ہمیں کیا سکھاتی ہے؟۔ وہ کہتی ہے کہ موجودہ دنیا،

اپنی تکمیلی حالت میں ترقی کرتے ہوئے ہی اس آج کے دور تک نمودار ہوسکی ہے۔ بنجامن سمجھتا ہے کہ تورات بیان کرتی ہے کہ" خدا نے تخلیقِ کائنات کا جب منصوبہ بنایا تھا تو سب سے پہلے دن اس نے 'دن' کو جنم دیا تھا۔ پھر دوسرے دن اس نے 'آسمان' کی پیدایش کی تھی۔ تیسرے دن 'اس نے 'خشک زمین' کو جنم دیا تھا۔ چوتھے دن سورج اور چاند تاروں کی تخلیق۔ پانچویں دن 'مچھلیوں اور پانی' کی تخلیق، اور آخری اور چھٹے دن 'چوپایوں اور انسانوں' کی تخلیق کی تھی"۔ ربی 'بنجامن' سوال کرتا ہے کہ پھر اگر انسان بھی اسی طرح بندر کی شکل وصورت، اور عادات واطوار سے تبدیل ہوتے ہوتے موجودہ اصل انسانی حالت میں سامنے آیا ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟۔ (Jewish History and Culture، امریکا، ص ۳۸-۳۹)۔ اتفاق دیکھیے کہ کمیونزم کا بانی کارل مارکس بھی ڈارون کی اس کتاب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ربی کا یہ بیان بہرحال ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں کرتا کہ یہودی مذہبی زعما بھی ڈارون کے نظریے سے متفق نظر آتے ہیں۔ پھر یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ مفاد پرست حضرات جھوٹ اور فاسد امور کی خاطر دلائل بھی آخر کہاں کہاں سے لے کر آتے ہیں، یعنی وہ اس معاملے میں مقدس کتابوں تک کو بھی نہیں بخشتے!

ایک طویل مدت تک ڈارون کے اس نظریے کی تشہیر ہوتی رہی۔ اپنی اصل الٰہی تخلیق، حضرت آدمؑ وحوّاؑ کو چھوڑ کر انھوں نے خود کو بآسانی بن مانسوں کی اولاد قرار دے لیا تھا۔ اگرچہ اس نظریے کے رد میں آج خود مغرب سے بے شمار کتابیں منظرعام پر آرہی ہیں لیکن کوئی مضائقہ نہیں اگر اس کے ایک دو پہلوؤں کا ہم خود بھی جائزہ لے لیں۔

کہا گیا تھا کہ انسان بننے کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے اس نے پہلے اپنے اگلے دونوں پاؤں اٹھا لیے تھے اور جھک کر چلنے لگا تھا (اس قسم کی مفروضہ تصاویر بھی انسائی کلوپیڈیا میں عام نظر آتی ہیں)۔ تاہم عقل ان کی اس دلیل کو تسلیم کرنے سے اِبا کرتی ہے۔ وہ اسے پہلی فرصت ہی میں رد کردیتی ہے کیونکہ انسان کچھ عرصے کے لیے تو جھک کر چل سکتا ہے لیکن اس صورت میں وہ خود کو مسلسل برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ایسا کرنا اس کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ حیوانات بے فکر ہوکر، اور آرام سے یا تو چاروں ہاتھ پاؤں کی مدد سے چل سکتے ہیں یا پھر محض دو پیروں کی مدد سے۔ لیکن یہ کہ ان کے پیر تو

چار ہوں اور وہ چلیں سیدھے ہو کر محض دو پیروں کی مدد سے، تو یہ عمل حیوانات کے لیے ممکن ہی نہیں ہے! پھر یہ بھی کہا گیا کہ ارتقا کی منزل ہی میں زرافے نے اُونچے درختوں سے غذا حاصل کرنے کے لیے اپنی گردن موجودہ شکل میں تبدیل کی تھی۔ حالانکہ یہ بھی محض ایک واہمہ ہی ہے کیونکہ سائنس دانوں نے بہت تحقیق کے بعد آگاہ کیا ہے کہ اب سے چار پانچ ہزار سال پہلے کے زرافے کے جوڑھانچے دریافت ہوئے ہیں، ان میں بھی اس کی گردن آج ہی کی مانند لمبی پائی گئی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ڈارون کے نظریات و انکشافات شکوک وشبہات کی نذر ہونے لگے۔ حیرت انگیز طور پر سائنسی تحقیق سے صورت حال ایک بالکل نئے انداز سے سامنے آنے لگی۔ معلوم ہوا کہ حقائق وہ نہیں ہیں جو ڈارون نے پیش کیے تھے، بلکہ حقائق اس کے ماسوا کچھ اور ہیں۔ سائنس دانوں نے بتایا کہ ڈارون نے اپنے یہ نظریات کسی بھی لحاظ سے ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں کیے ہیں۔ بات کی وضاحت کی خاطر انھوں نے اس موضوع پر دلائل بھی فراہم کیے، اور مضامین و مقالات کا ایک نہ رُکنے والا سلسلہ بھی شروع کیا۔ انھوں نے بتایا کہ انسان اپنی ابتدا میں بھی آج ہی کی طرح کا ایک مکمل انسان تھا جس کا بندروں کی نسل چیمپینزی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن حقائق کی روشنی میں لائے جانے کے باوجود مذکورہ بالا گمراہ کن نظریہ آج بھی حسبِ سابق شدومد کے ساتھ پھیلایا جا رہا ہے۔ نئی تحقیقات اپنی جگہ، لیکن ڈارون کا نظریۂ ارتقا اپنی جگہ!۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ دہریے نظریات کے حامل دانش وران، دنیا کے لوگوں کو ان کے تخلیق کرنے والے خدا سے بالکل کاٹ کے رکھ دینا چاہتے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ مذہب اور خدا کا دنیا میں کہیں بھی چرچا ہوتا رہے۔ اسی سلسلے کو یہ لوگ 'الیومیناتی نظام' (یعنی روشنی کا نظام) قرار دیتے ہیں۔ الیومیناتی دانش وران قرار دیتے ہیں کہ دنیا میں محض ان کے جنم شدہ شیطانی نظام ہی کو بالادستی دی جانی ہوگی اور اسی کا سکہ یہاں رائج ہو کر رہے گا۔ اگرچہ وہ اسے 'روشنی کا نظام' قرار دیتے ہیں لیکن اپنی اصل میں یہ 'اندھیرے اور شیطنیت کا نظام' ہے۔

چنانچہ انھی کے تربیت یافتہ مادہ پرست ذرائع ابلاغ، اور روحانیت سے جان چھڑانے والے باغی سائنس دان ہیں جن کی تاریک کتابیں روشنی کے اس دور میں بھی مسلسل سامنے آتی چلی جا رہی ہیں۔ عالمی ذرائع ابلاغ بھی انھی کی مانند اس نظریے کو فروغ دینے میں پیش پیش ہیں، کیونکہ

ان کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ حقائق سے زیادہ وہ افسانوں اور سنسنی خیزیوں میں دل چسپی لیتے ہیں۔ یہی ان کے روزگار کی شاہ کلید بھی ہے۔ چنانچہ انسانی ارتقا کے مختلف درجوں کی فرضی تصویریں دنیا بھر میں پھیلا دینے والے لوگ اور ادارے بھی یہی ہیں۔ انھی مفکرین نے کمپیوٹر کی چال بازیوں کی مدد سے مردوں اور عورتوں (انسانوں) کو مکمل برہنہ حالت میں جسم پر گھنے بال رکھے ہوئے دکھایا ہے اور انھیں تعلیمی نصاب میں شامل کروایا ہے۔ بلکہ حیرت انگیز طور پر وہ تو ان کے جسموں پر پتے بھی نہیں دکھاتے جن کا وہ تعلیمی اسباق میں بہت چرچا کرتے ہیں۔ حالانکہ بندر نما انسان یا انسان نما بندر اگر کسی حد تک چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا اور اس کا دماغ بھی کم از کم کسی درجہ 'ذہنی ترقی' بھی کر چکا تھا، تو اپنے پوشیدہ حصوں کو تو اسے فوراً ہی ڈھانپنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی کیونکہ شرم و حیا تو اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے اندر بھی رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مرغی سب کے سامنے کبھی انڈے نہیں دیتی اور جانور اپنی دموں کو عموماً گرا کر ہی رکھتے ہیں۔

آج کی ترقی یافتہ خواتین بھی چوبیس گھنٹے اور تین سو پینسٹھ دن بغیر لباس کے زندگی نہیں گزار سکتیں۔ کیونکہ مرد ہو یا عورت، انسان اپنی شرم و حیا کے ہاتھوں مجبور ہے۔ دوسری جانب موسموں کے بھی اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں! حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں ان الیومیناتی لوگوں کو ایک تصویر بھی اپنی اصلی حالت میں حاصل نہیں ہو سکی ہے!۔ سائنسی حقائق کے پہلو بہ پہلو یہ لوگ جعلی و مسترد شدہ نظریات کو بھی مسلسل گردش میں رکھتے ہیں۔

پروپیگنڈا اصل میں ایک بہت طاقت ور ہتھیار ہے۔ صحیح یا غلط، دونوں نظریات کو بلا جبر، دنیا بھر کی ۷ارب کی آبادی سے اگر از خود منوانے کا کسی کا ارادہ ہو تو کتب، رسائل، اور دیگر ذرائع ابلاغ، اس کی اس آرزو کو چند سالوں ہی میں بآسانی پورا کر سکتے ہیں، جب کہ ان کی مدد کے بغیر ان کاذب نظریات کا رد، اور اصل حقائق سے لوگوں کی باخبری، تقریباً ناممکن بنا دی جاتی ہے!۔

پلٹ ڈاؤن مین (Piltdown Man)

ڈارون کے نظریے کی اشاعت کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس کے خیالات کو بہ لطف و کمال آگے بڑھانے والے دین بے زار سائنس دانوں نے پھر ایک اور چال بھی چلی۔ انھوں نے بہت بعد میں ایک ایسا درمیانی انسان بھی 'دریافت' کر لیا جو بقول ان کے ۳۰۰، ۴۰۰ سالوں کے بعد

بس مکمل انسان کی شکل میں ڈھلنے ہی والا تھا۔

یہ ۱۹۱۲ء کی بات ہے جب انگلینڈ میں اسی کے تقریباً ہم نام ایک اور سائنس دان چارلس ڈاسن نے برطانوی گاؤں Piltdown میں ایک حیوانی سر کا ڈھانچا پایا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے سر کا ڈھانچا اور جبڑے کی ہڈی چیمپینزی کی، اور دانت انسانوں کے سے بتائے گئے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد حتمی طور پر طے کر دیا گیا کہ ڈارون کی جانب سے پیش کیا جانے والا نظریۂ ارتقا بالکل درست تھا، اور یہ کہ یہ انسان اس کا عملی و عقلی ثبوت ہے۔ ڈھانچا چونکہ 'پلٹ ڈاؤن' نامی علاقے برطانیہ سے ملا تھا، اس لیے ڈھانچے کو بھی Piltdown Man کہہ کر پکارا جانے لگا۔

اپنی اس دریافت پر سائنس دان اس درجے خوش ہوئے کہ پھر اس پر وہ تحقیقی مقالے لکھنے لگے اور اسے نصاب میں شامل کروایا۔ کہا گیا کہ انسانی وحیوانی یہ ڈھانچا کم از کم ۵ لاکھ سال پرانا ہے۔ مزید یہ بھی کہا گیا کہ یہ ڈھانچا کسی یورپی فرد کا ہے، جب کہ بعض اخبارات نے حسبِ دستور اسے کسی عورت کا ڈھانچا گردانا! اپنے کارنامے پر یہ حضرات اس درجے پُرمسرت تھے کہ اس پر کم از کم ۵۰۰ مقالے لکھے گئے اور ۴۰ برسوں تک اسے اہمیّت دی جاتی رہی۔ حد یہ ہے کہ آج کل کے 'ایچ جی ویلز' اور 'برٹرینڈ رسل' جیسے معروف دانش ور حضرات بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے اسے اپنی کتابوں بالترتیب *The Outline of History* اور *A History of Western Philosophy* میں انسان کی جدید علمی فتوحات میں شمار کیا۔ تاہم دھوکے بازی زیادہ دیر تک اپنا بھرم نہیں رکھ سکی کیونکہ دھوکا بازی بہرحال دھوکا بازی ہی ہوتی ہے اور حقائق بہرحال اپنا آپ منوا کر ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ۴۰ برسوں کے بعد جا کر کہیں پتا لگا کہ اس ڈھانچے کی تمام تر کہانی بے بنیاد ہے۔

برطانوی عجائب گھر کے ایک نگراں Kennith Okley نے ۱۹۵۲ء میں اس پر کچھ مزید طبی و سائنسی تحقیقات کیں تو پتا لگا کہ اس کے بارے میں جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے، وہ کئی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ اس نے آگاہ کیا کہ کسی فرد نے چیمپینزی کے بڑے دانتوں کو گھس کر انسانوں جیسا چھوٹا کیا ہے اور ڈھانچے کو ایک خاص رنگ سے رنگ دیا ہے تاکہ ایک نئی انسان و بندر نما شکل سامنے آسکے۔

اس نئے انکشاف نے تو گویا سائنس کی دنیا میں ایک بار پھر وہی قدیم ہلچل مچا دی۔ کس کو پتا تھا کہ عظیم سائنس دان 'ڈارون' کا نظریہ یوں بالکل تار تار ہو جائے گا کیونکہ اس طرح کی صورتِ حال کا کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ بہرحال بہت چھان پھٹک کرنے کے بعد آخرکار اعلان کر دیا گیا کہ ''دریافت شدہ ڈھانچا سائنسی لحاظ سے تاریخ کا سب سے بڑا دھوکا ہے!''۔ جدید ماہرین نے واضح کیا کہ مذکورہ 'شکل وصورت' میں بعض جعل سازیاں کی گئی ہیں اور انسان کی شکل میں ڈھالنے کی ایک دانستہ کوشش کی گئی ہے۔ نیز یہ کہ چیمپینزی کا جبڑا وغیرہ بھی کسی لاکھوں سال پہلے کا نہیں بلکہ محض حالیہ مرے ہوئے کسی بندر کا ہے۔ اس انکشاف کے نتیجے میں ہلچل کے بعد سے پلٹ ڈاؤن مین کا وہ ڈھانچا برطانوی عجائب گھر سے فوری طور پر ہٹا دیا گیا جہاں ۴۰ برسوں سے وہ مسلسل دنیا کی 'معلومات' میں اضافہ کر رہا تھا!۔

ڈارون اور اس کے قبیل کے دیگر مفکرین کے یہ نظریات علمی وسائنسی فضا میں تقریباً ایک صدی محض اس لیے چھائے رہے کہ اس دور تک جدید سفری آسانیاں، حساس تحقیقاتی آلات، خوردبین وڈوربین، تشخیصی سہولتیں، سائنسی علوم، اور غور وفکر کی صلاحیتیں وغیرہ، ہمہ معیاری اور بااعتماد حد تک سامنے نہیں آسکی تھیں۔ لیکن جوں جوں سائنس آگے بڑھتی رہی، اور علم اپنا دامن وسیع تر کرتا رہا، ڈارون کے نظریات بھی اسی لحاظ سے شکوک وشبہات کی زد میں آتے چلے گئے۔

حقائق اور تہہ تک پہنچ جانے والے علم کی آج کی یہ دنیا، نہ تو چارلس ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو درست مانتی ہے اور نہ چارلس ڈاسن کے خود ساختہ 'پلٹ ڈاؤن مین' کو کوئی اہمیت دینے کو تیار ہے۔ کل کا دھوم مچا دینے والا 'پلٹ ڈاؤن مین' آج کا محض افسانہ بن کر رہ گیا ہے!

کتابیات

۱- ہارون یحییٰ *Tell Me About the Creation* - New Delhi

۲- انسائی کلوپیڈیا، جلد نمبر ۱۲، کولیرز، امریکا   ۳- انٹرنیٹ، وکی پیڈیا سرچ

۴- *Jewish History and Culture*, Alpha Publishers, U.S.A.

۵- عظمتِ قرآن، مولانا وحید الدین خان، بھارت

ڈاکٹر سیّد عبدالباریؒ

رفیع الدین ہاشمی

وابستگانِ اُردو زبان و ادب خصوصاً ادب اسلامی سے دل چسپی رکھنے والوں اور تحریکِ اسلامی کے حلقوں کے لیے ڈاکٹر سیّد عبدالباری (شبنم سبحانی) کی رحلت (یکم ستمبر ۲۰۱۳ء) ایک بڑا المناک سانحہ ہے۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب، نقاد اور شاعر تھے۔ بنیادی طور پر وہ ایک معلم تھے اور اس حیثیت سے انھوں نے ہزاروں تلامذہ کی تعلیم و تربیت کی۔ وہ تحریک ادب اسلامی ہند کے قافلہ سالاروں میں سے تھے۔ مسلسل ۲۴ برس وہ ادارہ ادب اسلامی ہند کے صدر اور تقریباً ۲۷ برس سیکرٹری جنرل رہے۔

سیّد عبدالباری ۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو یوپی کے ضلع فیض آباد کے ایک قصبے ٹانڈا میں پیدا ہوئے۔ گورکھ پور یونی ورسٹی سے بی اے کیا۔ پھر وہیں سے ایم اے اُردو اور ایم اے انگریزی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم اے اُردو میں انھوں نے لکھنؤ یونی ورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ بعدازاں اسی لکھنؤ یونی ورسٹی سے انھیں اُردو میں پی ایچ ڈی کی سند عطا ہوئی۔ اس سے پہلے چند سال تک وہ رام پور کی ثانوی درس گاہ اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ سے عربی زبان و ادب کی تحصیل کرتے رہے تھے۔ مدرسۃ الاصلاح میں انھیں عروج احمد قادری، جلیل احسن ندوی اور صدرالدین اصلاحی جیسے علما سے کسبِ فیض کا موقع ملا اور رام پور میں انھیں مائل خیرآبادی، مولانا عبدالحی، افضل حسین اور مولانا حامد علی کی راہ نمائی حاصل رہی۔

ابتدا میں وہ انگریزی کے لیکچرر رہے۔ بعدازاں اودھ یونی ورسٹی فیض آباد سے ملحق گنپت سہائے پوسٹ گریجویٹ کالج سلطان پور میں طویل عرصے تک اُردو کے استاد رہے اور یہیں سے بطور صدر شعبہ اُردو وظیفہ یاب ہوئے۔

درس و تدریس کے ساتھ شاعری اور تنقید ادب کے شعبوں میں بھی ان کا قلم برابر رواں رہا۔ ان کا قلمی نام 'شبنم سبحانی' تھا۔ ۲۰۰۹ء میں ۵۵ سال کی منتخب نظموں کا مجموعہ فکر انگیز شائع کیا۔ ان نظموں میں فن پر فکر کو فوقیت دی گئی ہے۔ لیکن بیش تر منظومات سے ان کی شاعری کی تاثیر، اس کی فنی دل کشی اور فکر انگیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کا دوسرا شعری مجموعہ طرب خیز غزلوں پر مشتمل ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کی شاعری ایمان و یقین اور امید و روشنی کی شاعری ہے اور قاری کو حوصلہ، عزم اور ولولہ عطا کرتی ہے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں، نہایت کامیاب مشقِ سخن کی ہے۔

بعدازاں شاعری سے قدرے بے رخی برتتے ہوئے وہ نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ 'شبنم سبحانی' نے قلم رکھ دیا اور 'سیّد عبدالباری' نے قلم سنبھال لیا۔ بقول ڈاکٹر نیاز سلطان پوری: ''شاعر پر نثر نگار غالب آ گیا اور اپنے اصل نام سے انھوں نے کتابیں لکھنی شروع کیں''۔

بیسویں صدی کی ۱۴ ممتاز شخصیات سے ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی رُوداد انھوں نے ملاقاتیں کے عنوان سے ۲۰۰۳ء میں شائع کی۔ یہ انٹرویو (مصاحبے) دوام اور دوامِ نو کے زمانۂ ادارت میں، تمام حضرات سے ان کے مستقر پر حاضر ہو کر لیے گئے۔ ان میں قاری محمد طیب، عبدالماجد دریا بادی، محمد مسلم، بدر الدین طیب جی، مولانا صدر الدین اصلاحی، ڈاکٹر سیّد محمود، مولانا ابواللیث اصلاحی اور سیّد ابوالحسن علی ندوی شامل ہیں۔ یہ مصاحبے، روایتی انداز کے سوال و جواب تک محدود نہیں۔ وہ بھرپور انداز سے شخصیت کا تعارف کراتے ہیں۔ (ان تعارفات میں وہ ایک کامیاب مرقع نگار اور خاکہ نویس کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں) اور ان شخصیات کی قیام گاہوں تک پہنچنے کی رودادِ سفر بیان کرتے ہیں۔ یوں ان مصاحبوں کو پڑھتے ہوئے سفرنامے کا لطف بھی محسوس ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت کی سیاست کے نشیب و فراز اور بطور اقلیت مسلمانوں کی زندگی اور ان کی جدوجہد کے حوالے سے ملاقاتیں نہایت اہم ہے، بلکہ اس کی حیثیت حوالے کی ایک کتاب کی ہے۔

۲۰۰۹ء ہی میں سیّد عبدالباری صاحب نے انوکھے لوگ، نرالی باتیں شائع کی جو بیسویں صدی کی ۲۰ 'نرالی شخصیتوں' کے خاکوں اور ان کے افکار و خیالات پر مشتمل ۲۰ مضامین کا مجموعہ

ہے۔'انوکھے لوگوں' میں مولانا حسین احمد مدنی، سیّد مودودی، حکیم اجمل خان، سیّد محمود، ابوالکلام، حسرت موہانی، آیت اللہ خمینی، صدرالدین اصلاحی، مولانا دریا بادی اور ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ خاکے (یا مضامین) تعارفی وسوانحی ہیں اور تنقیدی وتبصراتی بھی۔ زیادہ تر انھوں نے شخصیات کے محاسن بیان کیے ہیں اور معائب سے صرفِ نظر کیا ہے۔

لکھنؤ کا شعر و ادب ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھوں نے گورکھپور یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اسی تسلسل میں انھوں نے لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء) کے عنوان سے ایک اور کتاب شائع کی جسے وہ خود اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کا 'دوسرا حصّہ' قرار دیتے ہیں۔

تنقیدی مقالات کے پانچ مجموعے (ادب اور وابستگی، کاوش نظر، نقد نوعیار، آداب شناخت، افکار تازہ) ان سے یادگار ہیں۔ آداب شناخت پر اظہار خیال کرتے ہوئے، اُردو تحقیق وتنقید کی نامور اور بزرگ شخصیت ڈاکٹر محمود الٰہی نے لکھا: ''ان کی تحریر پختہ اور فکر نہایت مستحکم ہے۔ وہ حق و ناحق، خیر و شر کا ایک متعین پیمانہ رکھتے ہیں۔ اسلامیات کے گہرے مطالعے کا اثر ان کی تحریروں پر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کو جاہ و منصب کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ اخلاص کے ساتھ ادب کی بے لوث خدمت انجام دیتے رہے ہیں''۔

سیّد عبدالباری کی فکر وسوچ اور قلمی کاوشوں کا دائرہ شعر و ادب تک محدود نہ تھا۔ وہ اپنے معاشرے کی فلاح و بہبود اور مسلمانوں کے مسائل پر بھی سوچتے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے سیکڑوں مضامین اور کالم لکھے۔ مزید برآں چند ایسی کتابیں بھی شائع کیں جن کا تعلّق مسلم معاشرے میں اخلاقی و دینی اقدار کی ترویج اور افراد امت کی تربیت ذہنی و دینی سے ہے، مثلاً: اسماے حسنٰی اور کردار سازی' جمہوریت، انسان دوستی اور اسلام' اسلام میں آدابِ اختلاف وغیرہ۔

ڈاکٹر سیّد عبدالباری فکری اعتبار سے ادب اسلامی کے علم بردار تھے۔ جیسا کہ ابتدا میں ذکر آچکا ہے، انھوں نے ادارہ ادب اسلامی ہند کے صدر اور سیکرٹری کی حیثیت سے چھے دہائیوں تک خدمات انجام دیں۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر شکیب ارسلان کے بقول: 'وہ ایک پھرتیلے اور

شخص تھے‘۔ ادب اسلامی کے وابستگان کو متحرک کرنے کے لیے وہ خطوط نگاری اور مضمون نویسی کے ذریعے برابر کوششیں کرتے رہے۔ حیاتِ مستعار کے آخری عشرے میں انھوں نے ادارہ ادب اسلامی ہند کے ترجمان ماہنامہ پیش رفت دہلی کی ادارت کا فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ آخری زمانے میں وہ آل انڈیا ملّی کونسل کے ماہنامے ملّی اتحاد سے بھی منسلک رہے اور اپنے رشحاتِ فکر سے قارئین کی ذہنی آبیاری اور ان کی راہ نمائی کرتے رہے۔ active

سیّد عبدالباری سے راقم کے قلمی رابطے کا آغاز ۶۰ کے عشرے میں ہوا تھا۔ ان کی وفات سے چند ماہ پہلے تک خط کتابت رہی اور کبھی ٹیلی فون پر تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہا۔ ہمارے درمیان تصانیف کا تبادلہ بھی ہوتا رہا___ (اس تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں)۔

اُردو شعروادب کی دنیا بڑی حد تک پاکستان اور بھارت کے دو الگ الگ ایسے خطوں میں منقسم ہے جن کے بیش تر شاعر، ادیب اور نقاد افسوس ناک حد تک ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں۔ اس صورت حال میں پاکستان کے ادبی حلقوں میں سیّد عبدالباری (شبنم سبحانی) کا نام کسی قدر اجنبی محسوس ہو تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ خود بھارت کے نقادوں اور تاریخ نویسوں نے شبنم سبحانی کے تخلیقی ادب اور ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کو نظر انداز کیا ہے۔ اس پر بھی تعجب نہیں ہے کیوں کہ مرحوم شبنم سبحانی ادب میں صالح فکر اور اخلاقی اقدار کے علم بردار تھے۔

اُردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے بہت اچھی بات کہی ہے: ’جو آیا ہے، اُسے جانا ہی ہے لیکن ایسے کثیر الجہات لوگ جو معلم بھی ہوں، ادیب بھی، صحافی و نقاد بھی ہوں اور کسی حد تک سیاسی میدان میں سرگرم عمل بھی، اُن کا اُٹھ جانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری (شبنم سبحانی) کی وفات ایک ایسا ہی حادثۂ فاجعہ ہے۔ بس یہی دعا ہے کہ ؎

آسماں ’اس کی‘ لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

افغانستان کا مستقبل اور پڑوسی ممالک

ڈاکٹر محمد اقبال خلیل

افغانستان کے پڑوسی ممالک اور اس خطے کی دیگر اقوام سے اس کے تعلقات اور مستقبل کے کردار کے حوالے سے ایک مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

● **وسطی ایشیائی ممالک:** ۱۹۷۹ء میں روس نے افغانستان پر حملہ آور ہونے کے لیے وسطی ایشیائی ممالک کا راستہ استعمال کیا جو اس وقت عظیم سوویت یونین کا حصّہ تھے۔ افغانستان اور تاجکستان کے درمیان قدرتی سرحد دریاے آمو ہے جس کا شیر خان بندر کا پل روسی افواج کے آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ رہا۔ امریکا نے بھی اس کا فضائی اڈا اپنی فوجوں کی آمد کے لیے استعمال کیا۔ تین وسطی ایشیائی ممالک تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان، افغانستان کے ساتھ مشترکہ سرحدات رکھتے ہیں، جب کہ قازقستان اور کرغیزستان بھی قریب ہیں۔ اب بھی روس کا ان ممالک پر غیر معمولی اثر و رسوخ برقرار ہے جو ایک بار پھر عالمی طاقت کا کردار ادا کرنے کے لیے بے قرار ہے۔ ان ممالک کے افغانستان کے ساتھ لسانی، تہذیبی اور سماجی تعلقات کے ساتھ ساتھ گہرے تجارتی و معاشی مفادات وابستہ ہیں۔ افغانستان ان کے لیے ایک کاروباری گیٹ وے کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے وہ دیگر ایشیائی ممالک بشمول پاکستان اور ہندستان کے ساتھ تجارت کر سکتے ہیں۔ ترکمانستان، افغانستان، پاکستان اور بھارت (TAPI) نام کی مجوزہ گیس پائپ لائن اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

● **ترکی:** افغانستان میں موجود کئی قومیتیں، مثلاً ترکمان اور ازبک ترکی النسل ہیں۔ ترکی کی حکومتیں ان کو مدد بھی دیتی رہی ہیں۔ جنرل رشید دوستم یا جنرل عبدالمالک پر جب برا وقت آیا تو انھوں نے ترکی ہی میں پناہ حاصل کی۔ ترکی وہ واحد اسلامی ملک ہے جس کی فوجیں ناٹو کے ماتحت افغانستان

میں موجود ہیں۔ ترکی افغانستان میں امن کے قیام اور معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ افغان گروہوں میں مصالحت پیدا کرنے اور مذاکرات کے لیے استنبول ایک اچھا مرکز بن سکتا ہے۔

● چین: دنیا کی نئی اور تیزی سے رُوبہ ترقی عالمی معاشی طاقت چین بھی انتہائی شمال میں افغانستان کے ساتھ ہمسایگی کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس کا افغانستان میں کردار بہت محدود ہے۔ ایک زمانے میں افغانستان کی کمیونسٹ پارٹیاں 'شعلہ جاوید' اور 'افغان ملت' کو چینی کمیونسٹ پارٹی کی اعانت حاصل تھی لیکن وہ روس نواز خلق اور پرچم پارٹیوں کے مقابلے میں بہت کمزور تھیں۔ اب یہ عنصر زیادہ تر پختون قوم پرست گروپوں میں پایا جاتا ہے۔ چین کو طالبان دورِحکومت میں ان کی جانب سے چینی کاشغر میں مسلم باغی گروپوں کے ساتھ روابط پر اعتراض تھا۔ اب چین افغانستان میں امریکی موجودگی کی وجہ سے بہت محتاط ہے۔ لیکن آیندہ دور میں چین افغانستان کی تعمیرِنو اور معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

● ایران: افغانستان میں ایران کا کردار بہت اہم ہے۔ پاکستان کی طرح ایران نے بھی روسی جارحیت کے دوران لاکھوں افغان پناہ گزینوں کو پناہ دی تھی۔ ان کے افغانستان کے مختلف طبقات خاص طور پر شیعہ آبادی کے ساتھ قریبی تعلقات ہیں۔ آزاد خارجہ پالیسی کی بدولت ایران نے مختلف الخیال افغان گروپوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھے ہیں۔ جب انجینیر حکمت یار سابق وزیراعظم افغانستان پر سخت وقت آیا تھا تو کچھ عرصے تک وہ ایران میں رہے اور ایرانی حکومت نے ان کی میزبانی کی۔ موجودہ صدر حامد کرزئی اور ان کی حکومت کو بھی ایران کی معاونت حاصل ہے۔ حزب وحدت کے ساتھ ساتھ ان کے طالبان کے ساتھ بھی تعلقات ہیں۔ ایران میں کئی کانفرنسوں میں ان کے نمایندہ وفود شریک ہوتے ہیں۔ افغانستان کی تعمیر و ترقی میں بھی وہ اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ایرانی بندرگاہ چاہ بہار، افغانستان کے لیے ایک متبادل بحری راستے کا ذریعہ بن چکی ہے جہاں سے ایک پختہ سڑک بھی ایران نے افغانستان کی سرحد تک تعمیر کی ہے جس کا افغانستان میں زیادہ تر حصّہ بھارت نے مکمل کیا ہے۔ آیندہ دور میں بالخصوص امریکی و ناٹو افواج کے انخلا کے بعد ایران کا کردار افغانستان کے لیے بہت اہمیّت کا حامل ہے۔

● بھارت: بھارت اگرچہ افغانستان کا براہ راست پڑوسی ملک نہیں ہے لیکن اس کا افغانستان

کے ساتھ طویل تاریخی، سماجی، سیاسی و معاشی تعلق رہا ہے۔ اس لیے وہ اس کو اپنی توسیع ہمسایہ (Extended Neighbourhood) قرار دیتا ہے۔ بھارتی قیادت نے مہاتما گاندھی سے لے کر من موہن سنگھ تک افغانستان کے ساتھ ہر دور میں اپنا تعلّق برقرار رکھا ہے۔ جب افغانستان پر روسی قبضے کے بعد ببرک کارمل کی کٹھ پتلی حکومت قائم تھی، تو بھارت غیر کمیونسٹ ممالک میں واحد ملک تھا جس نے اس کی حکومت کو سفارتی سطح پر قبول کیا تھا۔ صرف طالبان حکومت کا دور ایسا وقت تھا جب وہ افغان امور سے بے دخل ہوگیا تھا۔ اس لیے امریکی مداخلت کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنا سفارت خانہ فعال کیا۔ اس وقت وہ کرزئی حکومت کے حامیوں میں ایک اہم طاقت کا کردار ادا کر رہا ہے۔ ملک کی تعمیرِ نو کے لیے اس نے ایک خطیر رقم ۲ ارب امریکی ڈالر بڑے بڑے ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کی ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں اس کی شرکت موجود ہے۔ بڑے منصوبوں میں زارنج سے دلارام تک ۲۱۸ کلومیٹر سڑک (جو افغانستان کو ایرانی بندرگاہ سے ملاتی ہے)، پل خمری سے کابل تک ۲۲۰ کے وی کی برقی ٹرانسمیشن لائن، ہرات میں سلمہ ڈیم (جس پر ایران کو اعتراض ہے)، افغان پارلیمنٹ کی عمارت، افغان ٹی وی نیٹ ورک اور کئی تعلیمی منصوبے شامل ہیں۔ بھارت مستقبل میں بھی افغانستان میں اپنی موجودگی برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اس کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہے۔

● **پاکستان**: پاک افغان تعلقات کا ایک اہم سنگِ میل ۱۹۶۵ء کی پاک و ہند جنگ ہے۔ اس نازک موقعے پر ظاہر شاہ نے پاکستان کو یقین دہانی کرائی کہ آپ اپنی مغربی سرحدوں سے بے فکر ہو جائیں۔ اسی طرح ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی افغان حکومت نے پاکستان کی درپردہ حمایت کی۔ سردار محمد داؤد خان جب برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے بھی پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کیے اور غالباً یہی ان پر روسی عتاب کی ایک وجہ بنی۔ نور محمد ترکئی اور حفیظ اللہ امین کے ادوار میں پاکستان کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوا اور بالآخر ۱۹۷۹ء میں روسی جارحیت کے بعد سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے۔ لیکن یہی وقت تھا جب عوامی سطح پر ایک بڑے پیمانے پر تعلّق قائم ہوا۔ انسانی تاریخ کے سب سے بڑے انخلا کے موقع پر پاکستان نے لاکھوں افغان مہاجرین کے لیے اپنا دامن کھول کر انصارِ مدینہ کا کردار ادا کیا۔

پاکستان نے لٹے پٹے افغان مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہر ممکن سہولتیں فراہم کیں اور

دل کھول کر ان کی میزبانی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام مجاہدین گروپوں کی بھی مدد کی اور آزاد دنیا نے افغانستان پر روسی تسلط اور تباہی و بربادی کی جو مذمت کی پاکستان اس میں پیش پیش رہا۔ پاکستان کا یہ تاریخی کردار ایک لازوال داستان ہے اور ہر افغان شہری جو اس خوف ناک صورت حال سے دوچار ہوا تھا اس کو اپنے دل میں بسائے ہوئے ہے۔ ۱۹۸۸ء میں جینوا معاہدے میں پاکستان کا اہم کردار رہا اور نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد مجاہدین کی حکومت کے قیام میں بھی پاکستان نے کلیدی کردار ادا کیا۔ پھر جب ۱۹۹۶ء میں افغانستان میں طالبان حکومت قائم ہوئی تو پاکستان اُن تین مسلم ممالک میں شامل تھا جس نے اس کو رسمی طور پر تسلیم کیا اور اس کی بھرپور حمایت کی۔

۲۰۰۱ء کے آخر میں جب امریکا کی قیادت میں ناٹو افواج نے اسامہ بن لادن کے تعاقب میں افغانستان پر دھاوا بولا تو پاکستانی عسکری قیادت نے امریکی وزیر دفاع کولن پاول کی دھمکی پر یوٹرن لیتے ہوئے طالبان کے خلاف ان کا ساتھ دیا۔ اس طرح افغانستان میں طالبان حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ۲۰۰۲ء میں ایک اور افسوسناک واقعہ ہوا جب پاکستانی حکومت نے افغانستان کے اسلام آباد میں سفیر مُلّا عبدالسلام ضعیف کو امریکا کے حوالے کیا۔ بون کانفرنس کے موقعے پر پاکستان نے افغانستان میں کرزئی حکومت کو تسلیم کیا۔ بعد میں پاکستان اور افغانستان کا ایک مشترکہ قومی جرگہ بھی صلح و امن کے لیے قائم کیا گیا۔ ۲۰۱۰ء میں نیا پاک افغان تجارتی معاہدہ بھی طے پایا جس میں افغان تاجروں کو درآمدات کے لیے کافی سہولتیں دی گئیں۔

● **پاک افغان تعلقات نئی جہتیں:** افغانستان اور پاکستان کے درمیان ۲۲۵۰ کلومیٹر طویل سرحد ہے۔ کئی پختون اور بلوچ قبائل دونوں طرف آباد ہیں۔ دینی، مذہبی، سماجی و تہذیبی رشتے ہیں۔ کراچی کی بندرگاہ افغانستان کے لیے بھی اسی طرح اہم ہے جس طرح پاکستان کے لیے۔ نئی گوادر بندرگاہ افغانستان کو مزید قریب لاسکتی ہے۔ طورخم اور چمن بارڈر دنیا کی مصروف ترین بین الاقوامی گزرگاہیں ہیں جو دونوں ممالک کے شہریوں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہزاروں افراد دونوں طرف سے بغیر ویزے کے روزانہ آتے جاتے ہیں۔ پاکستان نے افغانستان کی تعمیر و ترقی میں بھی اپنا کردار ادا کیا ہے اور ۳۳۰ ملین ڈالر سے زائد رقم ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کی ہے۔ پاکستان اور افغانستان کی باہم تجارت کا حجم سالانہ ۳ ہزار ملین امریکی ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے۔

غیر رسمی تجارتی تبادلہ اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ پاکستان اس وقت بھی لاکھوں افغان مہاجرین کو پناہ دیے ہوئے ہے اور تمام تر مشکلات اور مسائل کے باوجود ان کے قیام میں مسلسل توسیع کر رہا ہے۔ کابل میں پاکستانی سفارت خانہ روزانہ ۱۲۰۰ ملٹی پل وزٹ ویزے بلامعاوضہ جاری کرتا ہے اور روزانہ ۵۰ ہزار افغانی بغیر ویزے کے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ پاکستان کے طبی ادارے افغانوں کو علاج معالجہ فراہم کرنے میں سرفہرست ہیں۔ گذشتہ چند سال میں ۳۰ ہزار سے زائد افغان طالب علموں نے پاکستان سے گریجویشن کی ہے۔ پاکستان ۲ ہزار سے زائد تعلیمی وظائف افغان طلبہ کو دیتا ہے۔

اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی خاص طور پر افغان طلبہ کی ایک پسندیدہ جامعہ ہے جہاں وہ سیکڑوں کی تعداد میں زیرتعلیم ہیں۔ اس وقت بھی افغان حکومت میں کئی کلیدی عہدوں پر متمکن شخصیات اسی جامعہ سے فارغ التحصیل ہیں۔ افغانستان میں پاکستانی حکومت کے اشتراک سے جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے ہیں ان میں رحمان بابا ہائی سکول کابل، علامہ اقبال فیکلٹی آف آرٹس کابل، سرسیّد فیکلٹی جلال آباد اور لیاقت علی خان انجینیرنگ فیکلٹی بلخ شامل ہیں۔

مستقبل میں پاک افغان تعلقات کا ایک درخشاں دور ممکن ہے۔TAPI گیس پائپ لائن کے ساتھ برقی لائن بھی آسکتی ہے۔ دریاے کابل کے پانی کے استعمال کے لیے ایک آبی معاہدہ بھی زیرغور ہے۔ ۲۰ لاکھ افغان مہاجرین کی افغانستان واپسی کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر پاکستانی ریلوے لائن جو انگریزوں کے دور میں طورخم تک پہنچ چکی تھی اور اب تک وہاں بچھی ہوئی ہے اگر جلال آباد تک بن جائے تو افغانستان کی معاشی ترقی کو زبردست مہمیز مل سکتی ہے۔ ان تمام کاموں کے لیے افغانستان میں ایک مستحکم جمہوری اسلامی حکومت کا قیام ازبس ضروری ہے جو تمام افغان اقوام کے لیے قابل قبول ہو اور ملک میں امن اور قانون کی بالادستی قائم کرسکے۔

پاکستان کے ساتھ افغانستان کا دیرینہ تنازعہ ڈیورنڈ لائن کو مسلمہ بین الاقوامی سرحد تسلیم کرنا بھی مستقبل میں پاک افغان تعلقات کو مستحکم کرنے میں ایک اہم نکتہ ہے۔ افغانستان سے پاکستان کے راستے منشیات کا فروغ بھی بہت خطرناک مضمرات رکھتا ہے۔

افغانستان میں بھارت کا کردار بذات خود کوئی بری چیز نہیں لیکن اس کو پاکستان کے خلاف

استعمال کرنا ہمارے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔ دونوں ممالک کا وسطی ایشیائی ممالک سے تعلّق اور وہاں کی تجارتی منڈیوں تک رسائی کی بہت اہمیّت ہے۔

۲۰۱۴ء افغانستان کے لیے بہت اہمیّت کا حامل ہے۔ صدارتی انتخابات، پارلیمانی انتخابات، ناٹو افواج کا انخلا جیسے اہم واقعات اس سال وقوع پذیر ہوں گے۔ صدارتی انتخابات میں اہم ترین نکتہ افغانستان میں صلح و امن کے لیے مذاکرات ہیں۔ ہر صدارتی امیدوار کی خواہش ہے کہ وہ متحارب گروہوں کے ساتھ مذاکرات کرے اور اس کی کامیابی کے لیے وہ ہر تدبیر اختیار کرنے کو تیار ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ایسا ہو اور افغان گروہ آپس میں بیٹھ کر معاملات طے کریں اور ملک میں امن قائم ہو۔

پاکستان کا افغانستان میں بہت اہم کردار ہے۔ بالعموم افغان دانشور اور عوامی رائے عامہ پاکستان سے شاکی ہیں اور افغانستان میں ہر بُرے واقعے کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھیراتے ہیں۔ اس رویے پر حیرت ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ لیکن پاکستانی حکومت اور اس کی ایجنسیوں کا رویہ کئی طرح سے ناقابلِ فہم اور مشکوک رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت پاکستان افغانستان میں ایک آزاد اور مستحکم جمہوری حکومت کے قیام میں مدد دے۔ وہ افغانستان کے داخلی معاملات میں کسی بھی قسم کی مداخلت سے گریز کرے۔ کسی مخصوص گروپ یا قومیت کی حمایت نہ کرے بلکہ بحیثیت مجموعی افغان ملت کی پشتیبانی کرے۔ افغان قوم کے مفاد میں جو چیز بہتر ہے وہی ہمارے لیے بھی بہتر ہے۔ ہماری منفعت اور نقصان ایک ہے۔ ہمیں اس کی اقتصادی اور معاشی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہے۔ بین الاقوامی تجارت، صنعت و حرفت، برآمدات و درآمدات، بنکاری غرضیکہ ہر میدان میں ہم ان کی حمایت میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ افغانستان سے امریکی افواج کے انخلا میں بھی ہم ضامن کا کردار ادا کریں۔ افغانستان میں ایک مضبوط جمہوری اسلامی حکومت کا قیام ہر پاکستانی کی آرزو و تمنا ہے لیکن اصل کام انھوں نے خود کرنا ہے۔ اپنے مسائل خود حل کرنے ہیں، اپنی قیادت خود منتخب کرنی ہے اور اپنا مستقبل اپنے ہاتھوں سے تعمیر کرنا ہے۔ قومیں مشکلات و مصائب سے گزر کر کندن بنتی ہیں اور افغان ملت میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک عظیم قوم کا خاصہ ہوتی ہیں۔

(یہ اس مقالے کا ایک حصّہ ہے جو مقالہ نگار نے ۱۳ فروری ۲۰۱۴ء کو کابل میں افغانستان کے مرکزمطالعات استراتیژیک و منطقوی کے تحت ایک بین الاقوامی سیمی نار میں پڑھا۔)

الاخوان المسلمون: قوت کا اصل راز

عبدالغفار عزیز

مخالفین طعنہ دیتے ہیں کہ: ''انھوں نے دعوت چھوڑ کر سیاست اپنا لی ہے''۔ مغرب نے بھی اسلامی تحریکوں کے لیے 'سیاسی اسلام' کی اصطلاح گھڑ رکھی ہے۔ اس کے بقول یہ اسلام کی سب سے خطرناک قسم ہے۔ لیکن اسلامی تحریک کے کارکن بھی عجیب ہیں، سنگین سیاسی بحران عروج پر ہے، خونیں فوجی انقلاب دن رات قتلِ عام کر رہا ہے، ۲۱ ہزار سے زائد کارکنان جیلوں میں ہیں، نام نہاد عدالتیں آئے روز طویل قید کی سزائیں سنا رہی ہیں لیکن مصر کی طالبات نے نئی مہم شروع کر دی ہے۔ مہم کا عنوان ہے: صلاۃ الفجر بدایۃ النصر، ''نمازِ فجر آغازِ نصر''۔

طالبات کے بقول: فرعون سیسی کے خلاف ہماری ساری تحریک اللہ کی خاطر ہے، اللہ کو منائے بغیر اس کی نصرت شاملِ حال نہیں ہوسکتی۔ طالبات ضد الانقلاب، نامی طالبات تحریک نے اپنی نئی مہم کے لیے مختلف اسٹکر، پٹیاں، پوسٹر اور پمفلٹ تیار کیے ہیں اور وہ فرداً فرداً تمام طالبات سے وعدہ لے رہی ہیں کہ نمازِ فجر کا خصوصی اہتمام کریں گی، جس کا مطلب ہے کہ باقی نمازیں بدرجۂ اولیٰ ادا ہوں گی۔ اس مہم کی ایک ذمہ دار تسبیح السید کے بقول ہماری مہم توقع سے بھی زیادہ کامیاب ہو رہی ہے اور طالبات کے ذریعے ہمارا پیغام ان کے اہلِ خانہ تک بھی پہنچ رہا ہے۔

مصر کے پہلے منتخب جمہوری صدر محمد مرسی کو ایک سالہ اقتدار کے بعد ہی رخصت کرتے ہوئے، قابض خونیں جرنیلوں نے پورا ملک خاک و خون میں نہلا دیا ہے۔ مصری عوام کی اکثریت اس فوجی انقلاب کو مسترد کر رہی ہے۔ گذشتہ تقریباً نو ماہ میں کوئی ایک روز بھی ایسا نہیں گزرا جس میں انقلاب مخالف مظاہرے نہ ہوئے ہوں۔ جنرل سیسی نے اپنے پیش رو مصری حکمرانوں کی طرح نہتے شہریوں کو کچلنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما کر دیکھ لیا ہے۔ لیکن ہر ظلم اور ہر جبر عوامی تحریک کو

مزید توانا کرنے کا ذریعہ ہی بن رہا ہے۔ سب تجزیہ نگار حیرت زدہ ہیں کہ ۸ ہزار کے قریب شہدا پیش کر کے بھی اخوان کیوں کر میدان میں کھڑے ہیں۔ صلاۃ الفجر بدایۃ النصر مہم اس حیرت و استفسار کا ایک واضح جواب ہے۔ یہی مہم نہیں، اخوان کی پوری تاریخ اور پوری تحریک ہی اس تعلّق باللہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ امام حسن البنا کی یہ ہدایت کہ ہمارا ایک روز بھی اللہ کی کتاب سے ملاقات کیے بغیر نہ گزرے، ہر کارکن نے مضبوطی سے پلے باندھ رکھی ہے۔ اخوان کے کارکنان نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ قرآن کریم کو دل کی نگاہوں سے پڑھتے اور عمل میں ڈھال دیتے ہیں۔ پھر یہی قرآن ہر ظلم کے مقابلے میں ان کی ڈھال بن جاتا اور انھیں ثابت قدم رکھتا ہے۔

گذشتہ تین سالہ عرصے میں اخوان کے بیانات، مضامین، مظاہروں اور اجتماعات میں ہر طرف یہی قرآنی رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ جامعہ ازہر کے طلبہ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے۔ ۲۲ مارچ کو جاری ہونے والے بیان کا عنوان ہے: سَنُحَاجِجُكُمْ بكل ما اقترفتموه فى دنياكم واخراكم ''ہم دنیا و آخرت میں تم سے تمھارے جرائم کا حساب لیں گے''۔ یہ بیان جامعہ ازہر کے ۱۶ طلبہ کو تین تین سال قید کی سزا سنائے جانے کے بعد جاری کیا گیا ہے۔ ان طلبہ پر الزام تھا کہ انھوں نے جامعہ میں مظاہرہ کیا۔ طلبہ اپنا مذکورہ بالا بیان دے کر گھر نہیں بیٹھ گئے۔ یہ بیان بھی ایک نئے مظاہرے کے دوران دیا گیا۔ اس دوران جامعہ ازہر طلبہ یونین کے قائم مقام صدر (صدر گرفتار ہے) نے عدلیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ اشعار بھی پڑھے کہ:

اذا جار الامير وحاجباه　　وقاضى الارض أسرف فى القضاء
فويل ثم ويل ثم ويل　　لقاضى الارض من قاضى السماء

(جب حکمران اور اس کے مصاحب ظلم ڈھانے لگیں، اور دنیا کے جج بے انصافی پر اُتر آئیں، تو پھر دنیا کے ججوں کے لیے منصفِ کائنات کی طرف سے ہلاکت ہے، ہلاکت ہے، ہلاکت ہے۔)

۲۱ ہزار سے زائد جو بے گناہ کارکنان جیلوں میں عذاب و اذیت جھیل رہے ہیں وہ بھی اسی عزم و یقین سے سرشار ہیں۔ ذرا اخوان کے رکن اسمبلی حمدی اسماعیل کو دیکھیے۔ وہ خود بھی گرفتار ہیں اور ان کا بیٹا ایک دوسری جیل میں پابند سلاسل ہے۔ حال ہی میں ان کے دوسرے بیٹے کو حکومتی سرپرستی میں اغوا کر لیا گیا اور رہائی کے لیے ۸۰ لاکھ پاؤنڈ (تقریباً سوا ارب روپے) تاوان کا مطالبہ

کیا جارہا ہے۔ حمدی اسماعیل نے اسی دوران کسی طرح اپنا تحریری پیغام اہلِ خانہ کو بھجوایا ہے، لکھتے ہیں: ''عزیز رفیقۂ حیات! امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آزما رہا ہے۔ وہ ہمیں گناہوں سے پاک کرنا چاہتا ہے اور ہمیں دنیا ہی میں اس وعدے سے نواز رہا ہے کہ آخرت کی منزل بہت خوب ہوگی۔ پروردگار ہم بندوں پر خود ہم سے بھی زیادہ مہربان ہے وگرنہ وہ اپنے انبیاے کرامؑ کو بھی آزمایشوں میں کیوں مبتلا کرتا۔ ذرا ان آیات کی تلاوت کر کے دیکھو: وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ...... (صٓ ۳۸:۴۱-۴۹)۔ اب آپ بھی ارادوں کو مضبوط کرلیں اور جدوجہد مزید تیز کردیں تاکہ ہم اپنی آزمایش میں سرخرو ہوسکیں۔ یہ زندگی، اصل زندگی کا صرف ایک منظر ہے۔ اس میں ہمیں اپنی بہترین پونجی آخرت کے لیے پیش کرنا ہے۔ یقیناً اللہ ہی کا فیصلہ غالب رہے گا، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں''۔

یہ کوئی اکلوتا خط یا اکلوتا اظہار نہیں، ہر کارکن اور ہر اسیر اسی جذبے سے سرشار ہے۔ ایک اسیر کے یہ جملے ملاحظہ کیجیے جو وہ اپنے معصوم بیٹے کے نام خط میں لکھ رہے ہیں: ''جانِ پدر! ذرا سوچو اگر میں اس تحریک میں گرفتار نہ ہوتا اور خدانخواستہ کسی ٹریفک حادثے کا شکار ہوجاتا، یا کوئی بیماری مجھے آن لیتی، تو اس صورت میں بھی صبر ہی کرنا پڑتا۔ یاد رکھو کہ ہمیں بہرصورت اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنا ہے۔ ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے فیصلوں کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا ہی آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنے گا۔ تمھیں اپنے آپ کو ایک ذمہ دار انسان ثابت کرنا ہے۔ قرآن کی تلاوت کبھی نہ چُھوٹے۔ نماز باجماعت ادا ہو، اپنی والدہ کو خوش رکھیں اور اس آزمایش میں ان کے معاون بنیں۔ اصل مردانگی کردار واخلاق کا نام ہے۔ اگر اس کڑے وقت میں بہادری نہ دکھائی تو آخر کب اس کا موقع آئے گا۔ اللہ سے ہردم مدد طلب کرتے رہو اور کبھی کسی کمزوری کو قریب نہ پھٹکنے دو''۔

ظلم و جبر کے مقابلے میں اخوان کی ثابت قدمی پر حیرت کا اظہار کرنے والوں کو ان کی قوت کا یہ اصل راز معلوم ہے، لیکن ہر فرعون کی طرح اقتدار کا نشہ انھیں بھی اس غلط فہمی کا شکار کیے ہوئے ہے کہ ''سب کو تہِ تیغ کردیں گے۔ میرا اقتدار ہی میری قوت رہے گا''۔ اخوانی کارکنان کا موسوی کردار جب ان کی چالوں کو بودا ثابت کرتا ہے، تو ظلم و تشدد پاگل پن کی آخری حدیں

جا چھوتا ہے۔ پہلے تو اخوان کو دہشت گرد اور غیرقانونی قرار دیا تھا، اب فلسطین کی تحریک حماس کو بھی دہشت گرد قرار دے دیا گیا ہے۔ مصر کے ساتھ ساتھ اہلِ غزہ پر غصہ اُتارنے کی سعی لاحاصل میں تیزی آ گئی ہے۔ ماہِ رواں کے دوران بھی غزہ کی حدود سے متصل کئی کلومیٹر کا علاقہ خاک میں ملا دیا گیا ہے۔ اسرائیل اور اس کے عالمی سرپرستوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے پورے سرحدی علاقے کے رہایشی علاقوں کو بارود سے اُڑا کر بلڈوزر چلا دیے گئے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مصری انتظامیہ گذشتہ چند ماہ میں ۱۳۵۰ سے زائد سرنگیں تباہ کر چکی ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اہلِ غزہ کی زندگی کی ڈور انھی سرنگوں سے بندھی ہے۔ ساتھ ہی ایک عدالتی فرمان کے ذریعے مصر میں موجود حماس کے تمام 'اثاثہ جات' ضبط کر لینے کا اعلان کر دیا گیا۔ حماس کے ترجمان نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''سیسی انتظامیہ اب ذرا ان اثاثہ جات کا اعلان بھی کر دے کیوں کہ ہمارے علم کے مطابق وہاں ہمارے کوئی اثاثہ جات ہیں ہی نہیں''۔ گویا کہ مصری فرمان کا اصل ہدف صہیونی ریاست کو خیرسگالی کا پیغام دینا ہی تھا۔

جنرل سیسی کے اقتدار کو استحکام و دوام بخشنے کے لیے ابتدائی ایام ہی سے ایک مہم یہ شروع کر دی گئی تھی کہ اب اس مدارالمہام کو منصبِ صدارت بھی سنبھال لینا چاہیے۔ کئی بار تو ایسی فضا بنا دی گئی کہ اعلانِ صدارت گویا اب چند روز کی بات ہے، لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر ابھی تک مصری عوام پر یہ احسانِ عظیم نہیں کیا جاسکا۔ مصری اور مغربی تجزیہ نگار اس کی کئی وجوہات بتاتے ہیں۔ ان تجزیوں کا مشترک نکتہ یہی ہے کہ خود حکمران ٹولے میں بھی اس بارے میں گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ صدر منتخب ہونے کے لیے جنرل سیسی کو بھی وردی اُتارنا پڑے گی۔ ہزاروں بے گناہوں کا خون اپنے اقتدار کی بھینٹ چڑھا دینے والے کو اپنے دائیں بائیں بیٹھے وردی والوں پر ابھی یہ بھروسا نہیں کہ وردی اُترتے ہی وہ اس کا کام تمام نہیں کر دیں گے۔ رہی سہی کسر ایک 'نامعلوم' فون کال کے ذریعے پوری کی جارہی ہے۔ سرکار کے ترجمان ایک ٹی وی چینل پر موصولہ یہ کال کسی 'وحید' نامی شخص کی ہے۔ مصر کے ایک معروف تجزیہ نگار ڈاکٹر حلمی القاعود کے مطابق گذشتہ تقریباً چار برس میں 'وحید' کی یہ چوتھی فون کال تھی۔ اس کا نمبر یا ٹھکانا کبھی معلوم نہیں کیا جاسکا۔ پہلی کال حسنی مبارک کے خلاف عوامی جذبات عروج پر پہنچ جانے کے دوران آئی تھی، جس میں اس نے

دعویٰ کیا تھا کہ حسنی مبارک کے اقتدار کا خاتمہ ہوجائے گا۔ جمال مبارک اس کا وارث نہیں بن سکے گا۔ دوسری کال صدر محمد مرسی کے انتخاب کے بعد تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ صدر مرسی کا اقتدار جلد ختم ہوجائے گا۔ تیسری کال جنرل سیسی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد تھی جس میں دعویٰ تھا کہ وہ صدارتی انتخاب نہیں لڑیں گے۔ چوتھی کال چند ہفتے قبل آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ملک کا اصل اقتدار اس وقت منظرعام پر موجود فوجی قیادت کے ہاتھ میں نہیں، خفیہ قیادت کے ہاتھ میں ہے۔ جنرل سیسی اس قیادت کا مجرد ایک آلۂ کار ہے۔ ملک کا آیندہ صدر وہ نہیں بلکہ اسی خفیہ فوجی قیادت میں سے کوئی شخص ہوگا جس کا نام ابھی کسی کے سامنے نہیں ہے۔ اسی چوتھی کال میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ صدر محمد مرسی کو جیل سے رہا کردیا جائے گا، لیکن پھر اغوا کرکے زندگی سے محروم کردیا جائے گا۔ ڈاکٹر حلمی قاعود کے مطابق: 'وحید' کوئی نام نہاد نجومی یا علمِ غیب رکھنے والا کردار نہیں بلکہ اسی 'اصل خفیہ قیادت' کا کوئی 'خفیہ ترجمان' ہے جو ان پیغامات کے ذریعے ایک تیر سے کئی کئی شکار کرنا چاہتا ہے۔

اسی عرصے میں فوج کے سابق سربراہ فیلڈ مارشل طنطاوی جو ۱۹۹۱ء سے ۲۰۱۲ء تک کے طویل ۲۱ برس تک فوجی سربراہ اور وزیر دفاع رہے، بھی ذرائع ابلاغ میں نمودار ہوئے اور انھوں نے ملک کی اکلوتی جمہوری منتخب حکومت سے نجات پانے پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ جنرل سیسی نے بھی اپنے اس پیش رو کی خوشامد نُما تعریفوں کے پُل باندھے ہیں۔ ڈاکٹر حلمی کے مطابق جنرل طنطاوی نے اپنے انٹرویو میں تقریباً ۲۰ مرتبہ ایک لفظ استعمال کیا اور وہ تھا: 'مُخَطَّطْ: منصوبہ'۔ ان کا کہنا تھا کہ ۳۰ جون ۲۰۱۳ء کو عوام بھی یہ منصوبہ سمجھ گئے اور صدر مرسی کے خلاف نکل آئے۔ جنرل طنطاوی نے جب بار بار 'منصوبے' کا ذکر اور اخوان سے نجات پر خوشی ظاہر کی تو انٹرویو کرنے والے نے پوچھ ہی لیا کہ ''پھر آخر آپ لوگوں نے اخوان کو اقتدار دیا ہی کیوں؟'' جواب میں انھوں نے مصری لہجے میں بے اختیار تین بار کہا: ''مَاسَلَّمْتُهَاشْ...... مَاسَلَّمْتُهَاشْ...... مَاسَلَّمْتُهَاشْ، ''میں نے انھیں اقتدار نہیں سونپا...... میں نے نہیں سونپا...... میں نے نہیں سونپا''۔ ہم نے عوام کے اصرار پر انتخابات کروائے اور عوام نے اخوان کو ملک پر قابض ہونے کا موقع دے دیا''۔

ان تمام حقائق سے قرآن کریم کے الفاظ کے مصداق: قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (اٰلِ عمرٰن ۳:۱۱۸) ''ان کے دل کا بُغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے''، عوام کا یہ یقین

مزید مستحکم ہوگیا ہے کہ جابر فرعونی نظام سے نجات کے لیے قربانیوں کا یہی سفر ناگزیر ہے۔ اخوان کے کارکنان سیّد قطب شہیدؒ کے یہ الفاظ ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں کہ: ''اللہ کی نصرت آنے میں دیر لگ سکتی ہے، کیونکہ قدرت یہ چاہتی ہے کہ باطل کا باطل ہونا دنیا کے سامنے کھل کر آجائے۔ اگر باطل پوری طرح کھوٹا ثابت ہوئے بغیر مغلوب ہوجائے، تو ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ اس سے پھر دھوکا کھا جائیں۔ اللہ چاہتا ہے کہ باطل کو پوری مہلت ملے، یہاں تک اس کے بارے میں کسی کو کوئی شبہہ نہ رہ جائے اور پھر اس کے زوال پر کسی کو کوئی افسوس نہ ہو''۔

اخوان بھی یقیناً انسان ہیں اور بلا استثنا ہر انسان قرآن کریم کی اطلاع کے مطابق کمزور بنایا گیا ہے، لیکن آزمایشوں کی بھٹی نے انھیں ایسا کندن بنادیا ہے کہ ہر عذاب و آزمایش کے بعد پہلے سے زیادہ مضبوط و توانا ہوکر اُبھرتے ہیں۔ گذشتہ تمام قتل و غارت سے شکستہ یا مایوس ہونے کے بجاے انھوں نے ۱۹ مارچ سے تحریک کا مزید پُرجوش دوسرا مرحلہ شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ مظاہرے تو پہلے بھی ایک دن کے لیے نہیں رُکے تھے، لیکن نئے مرحلے کے پہلے ہی روز ملک بھر میں ۳۵۰ مظاہرے ہوئے۔ اس وقت فوجی انقلاب مخالف درجنوں تنظیمیں میدان میں ہیں۔ طلبہ، طالبات، خواتین، مزدور، ڈاکٹر، کسان، اساتذہ___ ہر میدان میں الگ تنظیم و تحریک ہے۔ سب ہی اپنے اپنے شہدا پیش کر رہے ہیں۔ اس تحریر کے دوران ہی ایک ۱۴ سالہ بچے عمرو کی شہادت کی خبر بھی ملی ہے اور ایک صحافی خاتون کی بھی۔ پھولوں جیسے معصوم عمرو کے والدین نے آنسو بہائے لیکن الحمدللہ کا ورد کرتے ہوئے یہی کہتے رہے: ''لخت جگر چلا گیا...... لیکن کچھ عرصے سے یقین ہو چلا تھا کہ اسے تو ضرور ہی شہادت ملے گی...... کوئی جلوس یا مظاہرہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ عمرو کو اس کا پتا ہو اور وہ مظاہرین اور زخمیوں کو پانی پلانے کے لیے اس میں نہ چلا گیا ہو''۔

خاتون صحافی رقیہ اسلام جامعہ ازہر کے ایک بڑے عالم دین جناب ہاشم اسلام کی صاحبزادی تھیں۔ وہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ یونی ورسٹی کی طالبہ بھی تھیں۔ ہاشم اسلام کا کہنا ہے کہ ''انھوں نے میری رقیہ کو نہیں، مجھے سزا دی ہے کیوں کہ مَیں نے جنرل سیسی کے حق میں فتویٰ دینے سے انکار کر دیا تھا...... اگر مجھے اپنے فتوے اور مبنی بر دلیل راے کی قیمت بیٹی کی میت سے بھی زیادہ ادا کرنا پڑتی تو وہ بھی ہیچ تھی۔ البتہ غم اس بات کا ہے کہ جن علماے کرام نے جنرل سیسی کے

حق میں فتویٰ دیا تھا، رب کے دربار میں وہ بھی میری بیٹی کے قتل میں برابر کے مجرم قرار پائے‘‘۔

عمر نامی ایک اور نوجوان بھی کئی ماہ قبل اسی تحریک کے دوران زخمی ہوگیا تھا۔ دائیں پہلو سے جسم میں داخل ہونے والی گولی بائیں پہلو سے نکلی تو تمام اندرونی نظام کو کاٹتے ہوئے چلی گئی۔ تب سے علاج جاری ہے، لیکن اُمیدیں بار بار دم توڑ دیتی ہیں۔ ان کی والدہ کا ایک تفصیلی انٹرویو فریڈم اینڈ جسٹس اخبار میں شائع ہوا ہے۔ دیگر باتوں کے علاوہ وہ ایک تاریخی جملہ یہ کہتی ہیں: ’’اگر بیٹے کو شہادت نصیب ہوگئی تو یہ میری خوش بختی ہوگی۔ میرے لیے غم کا سب سے بڑا دن وہ ہوتا جس روز خدانخواستہ میرا بیٹا اللہ کی اطاعت کی راہ سے ہٹ گیا ہوتا‘‘۔

صلاۃ الفجر تحریك، قرآن سے جڑے ہوئے، شہادت پر نازاں اخوان کو بھی اگر دنیا دہشت گرد قرار دیتی ہے، تو کیا ایسا کرنے والے رب کے حضور بھی کوئی جواز پیش کرسکیں گے......؟

کچھ عرصہ قبل علامہ یوسف القرضاوی صاحب کا شریکِ سفر ہونے کا موقع ملا۔ دورانِ سفر عرض کیا کہ کوئی خاص نصیحت کیجیے۔ کہنے لگے: اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر دعا جامع اور الہامی دعا ہے لیکن یہ دعا کئی حوالوں سے بہت اہم ہے کہ اللھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ ’’اے اللہ! ہمیں حق کو حق دیکھنے اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرما، اے پروردگار! ہمیں باطل کو باطل سمجھنے اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرما‘‘۔ آیئے ہم بھی یہی دعا کرتے ہوئے رب کے حضور دست دعا بلند کریں۔

شمارہ اشاعت کے لیے جارہا تھا کہ فرعونِ مصر نے ظلم کی ایک نئی تاریخ رقم کردی۔ مصری عدالت نے دو روز کی ’طویل‘ سماعت کے بعد ۵۲۹ بے گناہ قیدیوں کو ’سزائے موت‘ کی سزا سنادی ہے۔ سزا یافتگان میں اخوان کے مرشدعام ڈاکٹر محمد بدیع، قومی اسمبلی کے منتخب اسپیکر ڈاکٹر سعد الکتاتنی، فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی کے نائب صدر ڈاکٹر محمد البلتاجی سمیت ملک کی نام وَر سیاسی، علمی اور قومی شخصیات شامل ہیں۔

یہ انوکھا فیصلہ اگرچہ ظلم و جبر کی عدالتی تاریخ کا سیاہ ترین فیصلہ ہے لیکن ہر سننے والا انصاف پسند بلااختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ ظلم کی انتہا اور ظالموں کے خاتمے کا اعلان ہے، ان شاءاللہ!

رسائل و مسائل

بھلی بات بولو ورنہ خاموش رہو

سوال: حدیث نبویؐ ہے کہ بھلی بات کہو یا خاموش رہو، تو کیا اس حدیث کی روشنی میں زیادہ بولنا حرام ہے؟

جواب: حضورؐ نے بے شمار حدیثوں میں زبان کی تباہ کاریوں سے خبردار کیا ہے۔ ان میں ایک حدیث یہ بھی ہے: مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْرًا اَوْ لِیَصْمُتْ (بخاری، مسلم) ''جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، تو اسے چاہیے کہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے''۔ ایک دوسری حدیث ہے: رَحِمَ اللّٰہُ اِمْرَءًا قَالَ خَیْرًا فَغَنِمَ اَوْسَکَتَ فَسَلِمَ، ''اللہ کی رحمت ہو اس شخص پر جس نے بھلی بات کہی اور اجر و نعمت کا حق دار ہوا یا خاموش رہا تو محفوظ رہا''۔

بلاشبہہ زیادہ بولنا اور بے وجہ بولتے رہنا انسان کے لیے باعثِ تباہی اور گناہوں کا سبب ہے۔ امام غزالیؒ نے ان گناہوں کی تعداد ۲۰ بتائی ہے، جو زبان کے غلط استعمال سے سرزد ہوتے ہیں۔ شیخ عبدالغنی نابلسیؒ نے اس تعداد کو ۷۲ تک پہنچا دیا ہے۔ ان میں سے اکثر گناہِ کبیرہ کے قبیل سے ہیں، مثلاً جھوٹ، غیبت، چغلی، جھوٹی گواہی، جھوٹی قسم، لوگوں کی عزت کے بارے میں کلام کرنا اور دوسروں کا مذاق اُڑانا وغیرہ وغیرہ۔

اس لیے بہتر یہی ہے کہ انسان حتی المقدور خاموشی کا راستہ اختیار کرے تاکہ ان گناہوں سے محفوظ رہے۔ خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ہونٹوں کو سی لے اور زبان پر تالا ڈال لے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو کسی بھلی اور معروف بات کے لیے کھولے ورنہ اسے بند رکھے۔

جو لوگ زیادہ بولتے ہیں ان سے اکثر خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں اور ان خطاؤں کے سبب

وہ لوگوں میں مذاق اور استہزاء کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے بندۂ مومن جب بھی کوئی بات کرے اسے اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ خدا کے فرشتے اس کی ہر بات نوٹ کر رہے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے: مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ۝ (قٓ ۵۰:۱۸) ''کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگراں موجود نہ ہو''۔ (علامہ یوسف القرضاوی، فتاویٰ یوسف القرضاوی، ص ۵۹-۶۰)

دوسرے شخص کی طرف سے عمرہ کرنا

س: جو لوگ حج کے لیے جاتے ہیں وہ وہاں اپنے اعزہ کی طرف سے عمرے کرتے ہیں۔ کیا صرف انتقال کر جانے والے اعزہ کی طرف سے عمرہ کیا جاسکتا ہے یا زندوں کی طرف سے بھی عمرہ کرنے کی اجازت ہے؟

ج: فقہاے کرام نے فی الجملہ دوسرے کی طرف سے عمرہ کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اس لیے کہ عمرہ حج کی طرح بدنی عبادت ہونے کے ساتھ مالی عبادت بھی ہے اور شریعت میں مالی عبادات کی دوسرے کی جانب سے انجام دہی کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ البتہ اس کی تفصیلات میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ کسی دوسرے شخص کی طرف سے عمرہ کرنا اس وقت صحیح ہوگا جب وہ ایسا کرنے کو کہے۔ مالکیہ کے نزدیک دوسرے کی طرف سے عمرہ مکروہ ہے، لیکن اگر کرلیا جائے تو ادا ہو جائے گا۔ شوافع کہتے ہیں کہ دوسرے کی طرف سے عمرہ کرنا اس وقت صحیح ہے جب اُس شخص پر عمرہ واجب رہا ہو اور اس کی ادائی سے قبل اس کا انتقال ہوگیا ہو، یا نفلی عمرہ، وہ خود نہ کرسکتا ہو۔ حنابلہ کہتے ہیں کہ کسی میت کی طرف سے عمرہ کیا جاسکتا ہے، البتہ کسی زندہ شخص کی طرف سے عمرہ اس وقت صحیح ہوگا جب اس نے ایسا کرنے کو کہا ہو۔ (ملاحظہ ہو: الموسوعة الفقهية، کویت، ۳۰/ ۲۲۸-۲۳۹)۔ (ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی)

غیر مسلموں کی زکوٰۃ یا چرمِ قربانی کی رقوم سے امداد

س: جماعت اسلامی/الخدمت کے تحت ہم مختلف مواقع پر غیر مسلموں (عیسائی، ہندو برادری) کے ساتھ تعاون کرتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر کرسمس کے موقع پر یہ کام کیا

جاتا ہے۔ راشن وغیرہ کی تقسیم کی جاتی ہے۔ عموماً ہمارے پاس راشن کی مد میں زکوٰۃ/ چرمِ قربانی کے ذریعے رقم آتی ہے۔ آپ سے درج ذیل اُمور میں رہنمائی درکار ہے:

۱- کیا زکوٰۃ سے غیرمسلموں کے ساتھ راشن کی صورت میں تعاون کیا جاسکتا ہے؟

۲- کیا چرمِ قربانی کی آمدنی سے راشن کی صورت میں تعاون کیا جاسکتا ہے؟

۳- کیا زکوٰۃ/ چرمِ قربانی کی آمدنی سے کسی بھی صورت میں غیرمسلموں کے ساتھ تعاون نہیں کیا جاسکتا؟

۴- کیا تالیفِ قلب میں مسلمانوں کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک کیا جاسکتا ہے؟

۵- تالیفِ قلب کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کے فرمان کے بعد اب کیا صورت ہے؟

ج : غیرمسلم اقلیتوں کے ساتھ صدقات، عطیات اور چرم ہاے قربانی کی رقوم سے تعاون کیا جاسکتا ہے لیکن زکوٰۃ کی رقم سے ان کی مالی اعانت نہیں کی جاسکتی۔ تالیفِ قلب نومسلموں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اب بھی ان کے ساتھ تعاون کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایسے نومسلموں کے ساتھ بیت المال سے مالی تعاون ختم کیا تھا جو مال دار ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی حکومت ان کے ساتھ مالی تعاون اس لیے کرتی تھی کہ وہ حکومت کے ساتھ محبت کریں اور اپنے سابقہ دین والوں کی مدد کے بجاے اسلامی حکومت کی مدد کریں۔ لیکن جب اسلامی حکومت مضبوط ہوگئی اور ایسے نومسلموں کے تعاون کی ضرورت نہ رہی تو تالیفِ قلب کی یہ مَد ختم کردی گئی۔ یہ تالیفِ قلب زکوٰۃ کی رقوم سے نہ ہوتی تھی بلکہ خُمس جو مالِ غنیمت کا ایک حصّہ ہے، سے ہوتی تھی۔ اب بھی اگر ایسا دور آجائے کہ اسلامی حکومت کو نومسلموں کی تالیفِ قلب کی ضرورت ہو تو اسے بحال کیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے عارضی طور پر عدم ضرورت کی وجہ سے اسے ختم کیا تھا۔ زکوٰۃ سے نومسلم فقرا کی امداد ہروقت کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مختلف مواقع پر غیرمسلم فقرا کو ہدیے اور تحفے چرم ہاے قربانی کی رقوم سے دیے جاسکتے ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کے لیے الگ سے مخصوص فنڈ ہو جو عطیات سے جمع کیا جائے۔ واللہ اعلم! (مولانا عبدالمالک)

ذاتی ہدیے یا تحریکی اثاثے کا تعیّن؟

س : ہمارے شہر میں جماعت اسلامی کے ایک ذمہ دار کے بقول ان کے ایک عزیز دوست نے جماعت اسلامی کی جملہ منصبی ذمہ داریوں کی ادایگی کے لیے انھیں گاڑی تحفتاً

دی ہے۔ تاہم، ہمارے بعض ساتھیوں کی راے ہے کہ مذکورہ ذمہ دارفرد کو یہ گاڑی جماعت اسلامی کے نام منتقل کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں رہنمائی فرمائیں کہ گاڑی موجودہ حالت میں وہ استعمال کریں یا جماعت اسے اپنے اثاثہ جات میں شامل کرے؟

ج: سب سے پہلے تو اُن صاحب سے معلوم کیا جائے کہ جنھوں نے وہ سواری، جماعت اسلامی کی جملہ ذمہ داریوں کی ادایگی کے لیے ہدیہ کی ہے۔ آیا انھوں نے ذمہ دار کو ذاتی حیثیت میں انھی کی ذات کے لیے سواری ہدیہ کی ہے یا جماعت میں صاحبِ نظم ہونے کی حیثیت میں جماعت کے لیے ہدیہ کی ہے، تاکہ مذکورہ ذمہ دار فرد اس کے ذریعے تحریکی کام آسانی سے کرسکیں۔

اگر ہدیہ کرنے والے دوست رحلت کر گئے ہوں تو پھر جماعت اسلامی کے ذمہ دار خود فیصلہ کریں کہ ان کے دوست نے انھیں کس حیثیت میں ہدیہ کی ہے۔ اس حوالے سے یہ بہرحال پیش نظر رکھنا ہوگا کہ وہ صاحبِ خیر، مذکورہ فرد کو جماعت اسلامی کی منصبی ذمہ داری ملنے سے پہلے بھی اگر وقتاً فوقتاً کوئی چیز بطور ہدیہ دیتے رہتے تھے تو پھر اس صورت میں وہ گاڑی بھی ہدیہ شمار ہوگی۔ نیز جماعت کی منصبی ذمہ داری ملنے کے بعد اس تصریح کے ساتھ ہدیہ کی ہو کہ یہ اسی طرح کا ہدیہ ہے جس طرح کا ہدیہ اس سے پہلے ان کی ذات کے لیے وہ صاحب کرتے تھے۔

اگر دوست کی طرف سے اس سے پہلے ذاتی حیثیت میں ہدیہ دینے کا معمول نہ تھا اور تصریح بھی نہیں ہے کہ یہ ہدیہ ذاتی حیثیت میں ان کی ذات کے لیے بطورِ ملک ہدیہ کیا گیا ہے، تو پھر یہ جماعت اسلامی ہی کے لیے ہدیہ شمار ہوگا اور اسے جماعت کا اثاثہ شمار کر کے جماعت کے اثاثوں میں شامل کیا جائے گا۔ درمختار میں ہے: ویجوز للامام والمفتی والواعظ قبول الھدیۃ لانہ یھدی الی العالم لعلمہ (ج۸، ص ۵۸) ''مسلمانوں کے امام، پیشوا، مفتی اور واعظ کے لیے ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، کیونکہ اسے اس کے علم وفضل کی وجہ سے ہدیہ کیا جاتا ہے''۔ گویا جب اسے اس تصریح کے ساتھ دیا جائے گا کہ یہ ہدیہ اس کی ذات کے لیے ہے تو پھر وہ اپنے لیے لے سکتا ہے۔ (مولانا عبدالمالک)

کتاب نما

An Exercise in Understanding the Quran، [قرآن کریم سمجھنے کی ایک مشق]، مؤلف: ڈاکٹر عرفان احمد خان۔ تقسیم کنندہ: قاضی پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۵۹۷۶۷۹، شکاگو ۶۰۶۵۹۔فون: ۲۹۶۲-۲۵۱-۶۳۰-۶۳۰+۱ صفحات: ۲۱۶۔ قیمت: درج نہیں۔

قرآن کریم اپنے بارے میں یہ بات فرماتا ہے کہ ''ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنادیا ہے۔ پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا'' (القمر ۵۴:۳۹)۔ گویا رب کریم نے جو اِس کتاب کا نازل کرنے والا ہے اسے ہر طالبِ نصیحت و ہدایت کے لیے آسان بنا دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے اور اس عظیم ترین کتاب کا مطالعہ کس طرح ہو؟

مفسرین کرام نے جہاں قرآنِ کریم کے معانی پر روشنی ڈالی ہے، وہیں اس کتابِ ہدایت کے قانونی، ادبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی پہلوؤں کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر عرفان احمد خان نے اپنے ۴۰ سالہ مطالعہ قرآن کے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے ہر سورت کے مضامین کو موضوعاتی ترتیب کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے کی ایک مشق کی ہے اور اس غرض کے لیے قرآن کریم کی آخری ۳۰ سورتوں کا انتخاب کیا ہے۔ ۱۳۱عنوانات کے تحت قرآنی اصطلاحات کا مفہوم بیان کیا ہے۔

یہ بظاہر ایک آسان کام نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک لافانی کلام کو محدود موضوعاتی تقسیم میں لانا اور پھر اس میں باہمی ربط پیدا کر کے مفہوم کو سمجھنا ایک محنت طلب کام ہے۔ ڈاکٹر عرفان احمد خان نے اپنی تمام تر توجہ اسی کام پر صرف کی ہے اور اپنی تحقیقی کتاب Reflections on the Quran میں (جولسٹر برطانیہ سے اسلامک فاؤنڈیشن نے طبع کی ہے) اپنی قرآنی فکر کو سادہ انداز میں پیش کردیا ہے۔ قرآن کریم کو سمجھنے کا یہ انداز ایک قاری کو خود

یہ تربیت دیتا ہے کہ وہ کس طرح براہِ راست قرآن کریم کے پیغام کو سمجھے اور تفسیر قرآن کے نکات جو بعض اوقات قاری اور قرآن کے درمیان حائل ہوجاتے ہیں، ان سے بچ کر قرآن کا فہم حاصل کیا جاسکے۔ یوں ایک طالب علم کو خود قرآن فہمی پیدا کرنے کی تربیت فراہم کی ہے کہ وہ خود آیات کے درمیان ربط کو تلاش کرسکے اور قرآنِ کریم کے جامع پیغام کو سمجھ کر زندگی میں نافذ کرسکے۔

اس کتاب کا تعارف ۵۸ صفحات میں الگ کتابی شکل میں طبع کیا گیا ہے جس میں سورۂ علق سے الناس تک چھے منتخب آخری سورتوں پر مبنی تدریسی انداز میں اس طریق فہم قرآن کو واضح کیا گیا ہے۔(ڈاکٹر انیس احمد)

مذاہبِ عالم ایک تقابلی مطالعہ، مولانا انیس احمد فلاحی مدنی۔ ناشر: ملک اینڈ کمپنی، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۳۹۲۔ قیمت: درج نہیں۔

برقی ابلاغ عامہ کے اس دور میں دنیا کے چار گوشے سمٹ کر ایک بستی بن گئے ہیں لیکن اس کے باوجود مختلف مذاہب اور تہذیبوں کی ایک دوسرے سے ناواقفیت میں کوئی بہت بڑا فرق واقع نہیں ہوا ہے، بلکہ ابلاغِ عامہ کے غیر ذمہ دارانہ رویے نے تعصّبات اور گمراہ کن تصورات کے پھیلانے میں اچھا خاصا منفی کردار ادا کیا ہے۔ آج مسلمان کا نام سنتے ہی مغرب و مشرق کا ایک غیرمسلم اپنے ذہن میں کسی دہشت گرد کا تصور لاتا ہے۔

مولانا انیس احمد فلاحی مدنی کی یہ تالیف اُردو دان افراد کے لیے ہندوازم، بدھ ازم، سکھ ازم، عیسائیت، یہودیت اور شینٹو ازم کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کرتی ہے۔ کتاب آسان زبان میں تحریر کی گئی ہے اور اختصار کے ساتھ ان مذاہب کے آغاز، بنیادی تعلیمات اور مصادر کے بارے میں ثانوی ذرائع سے اخذ کردہ معلومات سے بحث کرتی ہے۔ عیسائیت اور یہودیت کے حوالے سے قدیم اور جدید عہدناموں سے مناسب حوالے دیے گئے ہیں اور ساتھ ہی قرآن کریم نے یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں جو حقائق بیان فرمائے ہیں ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

فلاحی صاحب نے کتاب کے آغاز ہی میں اس کے دو مقاصد بیان کیے ہیں: اوّلاً اپنے اردگرد بسنے والے دیگر مذاہب کے افراد کے بارے میں مستند معلومات حاصل کرنا، اور دعوتی نقطۂ نظر سے مدعوئین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ ان کے معتقدات کیا ہیں اور انھیں دعوت کس طرح دی جائے۔

کتاب اکثر عربی مآخذ پر اعتماد کرتی ہے، جب کہ مذاہب عالم کے تقابلی مطالعے کے لیے ان کے اپنے مصادر کا ان کی اپنی زبان میں جاننا بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ استاذ محمد دراز نے اپنی عربی میں تحریر کردہ کتاب میں جن مغربی مفکرین کا ذکر معرب ناموں کے ساتھ فرمایا ہے اسے جوں کا توں اختیار کرلیا گیا ہے۔ بہت مناسب ہوتا اگر مؤلف ہر مذہب کی تعلیمات کے خلاصے کے ساتھ اُس مذہب کی مقدس کتب کے حوالے بھی براہِ راست درج کر دیتے۔

یہ کتاب ابتدائی اور تعارفی معلومات فراہم کرتی ہے۔ اگر اسے تقابل ادیان کے طریقۂ تحقیق کی روشنی میں مرتب کیا جاتا تو اس کی قدر میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب ایک مذہب کا احاطہ کرتا ہے۔ (ڈاکٹر انیس احمد)

عصرِ حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے، مولانا سیّد جلال الدین عمری۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی، جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵، بھارت۔ صفحات: ۸۰۔ قیمت: ۵۲ بھارتی روپے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے احیاے اسلام کی تحریک علمی اور تحقیقی بنیادوں پر استوار کی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسے رفقا عطا کیے جنھوں نے تحقیقی اور علمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ جماعت اسلامی ہند نے تصنیف و تالیف کے لیے جو ادارہ قائم کیا تھا وہ پہلے ادارہ تصنیف کے نام سے رام پور میں کام کرتا رہا، بعدازاں یہی ادارہ 'تصنیف و تالیف اسلامی علی گڑھ' کے نام سے علی گڑھ میں کام کرتا رہا۔ اس ادارے کے زیراہتمام ۱۹۸۲ء میں سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی شائع ہونا شروع ہوا۔ بہت جلد یہ تحقیقی مجلّہ اہلِ علم کی توجہات کا مرکز بن گیا۔

مولانا جلال الدین عمری نے مجلّہ تحقیقات اسلامی میں اسلامی تحقیقی معیار کی بہتری کے لیے متعدد مقالے تحریر کیے۔ انھیں یہ احساس رہا کہ اسلام کی صداقت منوانے کے لیے عصرحاضر کے تحقیقی معیار پر اسلامی تعلیمات کو مدلل انداز میں پیش کرنا ضروری ہے۔ یہ احساس گذشتہ صدی میں مسلم ممالک میں احیاے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والی دینی جماعتوں کے اکثر اہلِ علم کو بھی رہا۔ تقسیم ہند کے بعد بھی مسلمانوں نے دنیا کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے عمرانی اور طبعی علوم میں تحقیقی کوششیں جاری رکھیں۔

زیرنظر کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی میں شائع ہوتے

رہے۔ ان مضامین میں انھوں نے توجہ دلائی ہے کہ آج کس کس میدان میں تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ کتاب کے چند ایک مضامین کے عنوانات یہ ہیں: ○ اسلام اور دورِ جدید کے علمی مطالبات ○ عرب ممالک میں اسلامی علوم کا احیا ○ اسلام کے مطالعے کے اصول و شرائط ○ موجودہ الحادی فکر اور اسلام ○ احیاے اسلام کے علمی تقاضے ○ اقامت دین کے لیے علمی تیاری کی اہمیّت ○ اسلامی علوم میں تحقیق کا طریقۂ کار۔ آخر میں سیّد مودودیؒ کی علمی کاوشوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مصنف نے پیش لفظ میں قومی سطح کی ایک کمزوری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''ہماری ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وقتی اور ہنگامی کاموں کے لیے تو ہمارے اندر بڑا جوش اور جذبہ پایا جاتا ہے لیکن کسی علمی یا سنجیدہ کام کی تحریک نہ تو ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے اور نہ اس کی اہمیّت محسوس کی جاتی ہے..... اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے افرادِ اُمت میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو مختلف میدانوں میں علمی سطح پر اسلام کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرسکتے ہوں'' (ص ۸)۔ (ظفر حجازی)

اسلام، جمہوریت اور پاکستان، مولانا زاہد الراشدی۔ ترتیب وتدوین: محمد عمار خان ناصر۔ تقسیم کار: نیریٹوز (Narratives)، پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۰، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۳۰۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

پاکستان اسلامیانِ ہند کی طویل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے قائدین نے پاکستان کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے اسلامی، فلاحی اور جمہوری ریاست تشکیل دی جائے۔ اس جمہوری اسلامی ریاست میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہو اور دنیا دیکھے کہ اسلامی تعلیمات آج بھی قابلِ عمل ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے آج تک پاکستان میں جمہوریت اور اسلامی ریاست کی بحث نتیجہ خیز نہیں بن سکی۔ دینی جماعتوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کیا جسے حکومتوں نے حیلے بہانے سے ٹال دیا۔

زیرتبصرہ کتاب مصنف کے مضامین کا انتخاب ہے۔ ان مضامین میں مصنف نے نہایت وضاحت سے اسلامی ریاست، اسلامی نظام اور جمہوریت کے بارے میں علما کا موقف بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر بھی قانون سازی، عوامی مفاد پر مبنی معاشی منصوبہ بندی اور معاشرتی مسائل کا حل صرف اسلام کے پاس ہے (ص ۱۱۱)۔ خلافتِ راشدہ نے عملاً فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کیا اور حکومت کو عوام کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا۔

خلفاے راشدین ہی کے دور میں عوامی ضروریات کی فراہمی کا اہتمام کیا گیا۔ (ص ۱۱۰)

زیرنظر کتاب میں اس امر کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ کیا تصادم اور مسلح جدوجہد سے پاکستان میں اسلامی نظام رائج کیا جاسکتا ہے؟ مصنف کا موقف ہے کہ جمہوری نظام کو تسلیم کرتے ہوئے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ عوام کے منتخب نمایندوں کے لیے اقتدار کا حق تسلیم کیا جائے، قانون سازی پارلیمنٹ کے ذریعے ہو۔ انھوں نے کہا ہے کہ علما نے اجتہاد میں اجتماعیت کا راستہ اختیار کیا اور اس کی تنفیذ میں پارلیمنٹ کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ (ص ۸۶)

مصنف نے کتاب میں نو عنوانات کے تحت اظہار خیال کیا ہے۔ یہ عنوان حسب ذیل ہیں: اسلامی ریاست، اسلام کے سیاسی نظام کا تاریخی پہلو، قانون سازی کا طریق کار، اسلام، جمہوریت اور مغرب، سیاسی جماعتیں ___ نفاذِ اسلام کی بحث، حکومت کی تشکیل میں عوام کی نمایندگی، پاکستان میں نفاذِ اسلام کی جدوجہد اور تصادم اور مسلح جدوجہد کا راستہ۔ ان مضامین میں مصنف نے نہایت سلاست سے مدلل انداز میں اپنے افکار پیش کیے ہیں۔ ان کی زبان شائستہ اور رواں ہے۔ کتاب کے آخر میں پاکستان کے ۳۱ علما کے ۲۲ نکات بھی دیے ہیں جن کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ یہ علما کا اتنا بڑا اجتہادی اقدام ہے کہ قراردادِ مقاصد کے ساتھ یہ ۲۲ نکات کسی بھی اسلامی ریاست کی آئینی بنیاد بن سکتے ہیں۔ (ظفر حجازی)

کیا مسلمان ایسے ہوتے ہیں؟، ڈاکٹر امیر فیاض پیرخیل۔ ناشر: اشاعت اکیڈمی، عبدالغنی پلازا، محلّہ جنگی، پشاور۔ صفحات: ۵۹۵۔ قیمت: درج نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار صفات میں سے ایک صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ لوگوں کے لیے بڑے نرم مزاج ہیں۔ ایک خصوصیت یہ بھی بتائی گئی کہ وہ لوگوں کی ہدایت کے اتنے متمنی ہیں کہ ان کے پیچھے غم کے مارے گویا جان کھو دینے والے ہیں۔ حضور اکرمؐ کی تعلیمات پر عمل اہلِ ایمان کو دوزخ کی آگ سے بچانے والا عمل ہے۔ انسانوں کے لیے آپ کی خیرخواہی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اپنی جان کے دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپؐ نے دین اسلام کی بابت یہ فرمایا کہ دین تو ہے ہی خیرخواہی کا نام۔ دین میں دوسروں کی بھلائی کے سوا اور ہے بھی کیا۔ اسلام کی تعلیمات

انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہیں تاکہ یہ یکسو ہوکر اللہ کی رضا کے لیے اس کی بندگی کریں۔

زیرتبصرہ کتاب مسلمانوں کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہے۔ آج کا معاشرہ اخلاقی لحاظ سے رُوبہ زوال ہے۔ متعدد بُرائیاں مسلم سوسائٹی میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔ قرآنی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے اور دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے لوٹ کھسوٹ، رشوت ستانی، ظلم و جبر، بے حیائی، ناپ تول میں کمی اور مکروفریب جیسی بُرائیاں مسلم معاشرے میں عام ہیں۔ چالاکی و ہوشیاری جس سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ قرار دے لیا گیا ہے۔ محاسبہ اور آخرت کا احساس ختم ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے ہوسِ زر کے باعث اللہ اور رسولؐ کی تعلیمات کو فراموش کردیا ہے۔ کتاب میں ان تمام معاشرتی، اقتصادی، تجارتی اور سیاسی ناہمواریوں کو دُور کرنے کے لیے قرآن اور رسول اکرمؐ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی نہایت دردمندی سے اپیل کی گئی ہے۔ متعدد کتابوں سے اخلاق آموز واقعات لے کر قارئین کو احساس دلایا ہے کہ اللہ کی گرفت میں آنے سے قبل اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔

مصنف نے غیرمسلم مغربی اہلِ دانش کی تحریروں کو بھی پیش کیا ہے اور ان کی اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ مصنف مسلمان مردوں اور عورتوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ دنیا کی مرغوبات عارضی ہیں، آخرت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ مصنف نے سوال اُٹھایا ہے کہ کیا واقعی ہم مسلمان ہیں؟ جس مسلمان کا مطالبہ خدا اور رسولؐ کر رہے ہیں، وہ مسلمان ہم ہیں یا نہیں (ص ۶)۔ مصنف نے کتاب میں ۱۵۰؍احادیث ترجمہ و تشریح کے ساتھ پیش کی ہیں اور مسلمانوں سے توقع کی ہے کہ وہ ان پر عمل پیرا ہوکر صحیح مسلمان بنیں اور اپنے اعمال درست کریں۔ (ظفرحجازی)

قلزمِ فیض مرزا بیدل، شوکت محمود، ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲- کلب روڈ، لاہور۔ صفحات: ۲۴۹۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔

ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی فارسی کے معروف اور صاحبِ اسلوب شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اسلوب ایسا مشکل، اَدق اور پیچیدہ تھا کہ مرزا غالب جیسے مشکل پسند بھی کہہ اُٹھے ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

اُردو دنیا میں فارسی کے اس نابغہ شاعر کا تعارف زیادہ تر مرزا غالب اور ان کے مذکورہ بالا شعر کا مرہونِ منت ہے۔ اُردو کے اہلِ نقد و تحقیق نے بیدل پر درجن سے اُوپر کتابیں تصنیف اور تالیف و ترجمہ کی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ بیسیوں تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

زیرنظر کتاب بیدل کے سوانح، شخصیت اور فکروفن پر ایسے مقالات کا ایک انتخاب ہے جو رسائل کی پرانی فائلوں میں دفن، نظروں سے اوجھل اور بیدل کے عام قارئین کی دسترس سے دُور تھے۔ مقالات کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر معیار بہت اچھا ہے اور کیوں نہ ہو، جب لکھنے والوں میں محمد حسین آزاد سے لے کر ڈاکٹر نعیم حامد علی الحامد تک شامل ہوں (بشمول: سید سلیمان ندوی، غلام رسول مہر، ڈاکٹر عبدالغنی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجنوں گورکھ پوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)۔

مرتبِ کتاب 'یکے از خادمانِ بیدل' جناب شوکت محمود کا تفصیلی مقدمہ (ص ۶ تا ۲۴) بجاے خود بیدل شناسی کا ایک عمدہ جائزہ یا سروے ہے۔ انھوں نے زیرنظر مجموعے کی ضرورت اور مطالعۂ بیدل میں اس کی اہمیّت کو واضح کرنے کے ساتھ مشمولہ مضامین کے مآخذ اور ہر مضمون کی نوعیت، یا اس کا خلاصہ بھی بتایا ہے۔ شوکت محمود دُورافتادہ اور خطروں میں گھرے ہوئے شہر بنوں کے پوسٹ گریجویٹ کالج میں اُردو کے استاد ہیں۔ نادر اور وقیع منتخب مقالات کی اس اشاعت کے بعد، وہ اس کی جلد دوم بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔(رفیع الدین ہاشمی)

پانیوں کی بستی میں، صالحہ محبُوب۔ ناشر: ادبیات، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۳۷۲۳۲۷۸۸-۰۴۲۔ صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: ۲۷۵ روپے۔

بیسویں صدی کے ربع ثانی میں سیاسی، سماجی اور معاشی حالات نے جو صورتِ حال پیدا کی وہ افسانے کو بہت راس آئی اور یہی دور اُردو افسانے کا زریں دور تھا۔ رومانی اور ترقی پسند تحریکوں کے اثرات خاصے گہرے تھے۔ ان کے خلاف ردِعمل بھی ہوا اور نئے افسانہ نگاروں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں اگرچہ افسانے نے کوئی نئی کروٹ نہیں لی لیکن نئے افسانہ نگاروں نے اچھے افسانے لکھنے شروع کیے ہیں۔ صالحہ محبُوب کا شمار ایسے ہی ادیبوں میں کیا جاسکتا ہے۔

صالحہ محبُوب کے افسانوں کا مرکز و محور ماں ہے جو مامتا اور محبت و مروت سے بچوں کے

ذہنوں کی تشکیل اپنے خوابوں کے مطابق کرتی ہے۔ مادیت کی دوڑ میں جب ماں اور باپ کمانے اور ملازمت کی فکر میں ہوں ایسے میں ان افسانوں میں گھر کے حصار اور روایتی گھریلو ماں کے کردار کو عمدگی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ تربیت کے اصولوں اور معاشرتی اقدار کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب اور مادیت کے اثرات، نیز معاشرتی مسائل کو بھی زیربحث لایا گیا ہے۔

ایک فن کار کا فن اسی وقت قارئین کے لیے قابلِ قبول ہوتا ہے جب وہ ناصح اور مبلّغ بنے بغیر اپنی سوچ ان کے ذہنوں میں اُتار دے۔ صالحہ محبوب کے افسانے اس معیار پر پورا اُترتے ہیں۔ قارئین خصوصاً ایسی مائیں جو بچوں کی صحیح خطوط پر تربیت اور مثبت سوچ دینا چاہتی ہیں ان کے لیے یہ عمدہ سوغات ہے۔ (عبداللہ شاہ ہاشمی)

بچوں میں خوف، فوزیہ عباس۔ ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ڈی-۳۵، بلاک-۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی-۷۵۹۵۰۔ فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰-۰۲۱۔ صفحات: ۹۶۔ قیمت (مجلد): ۱۵۰ روپے۔

عام طور پر بچوں کو کتا، چھپکلی، لال بیگ یا جن بھوت سے ڈرایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ معمولی بات لگتی ہے لیکن اس کے بچوں کی شخصیت اور نفسیات پر دُوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فوزیہ عباس نے زیرتبصرہ کتاب میں بچوں کے خوف کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے اور اس کے اسباب، علامات اور تدارک کی تجاویز بھی دی ہیں۔ خوف کیا ہے؟ بچوں پر اس کے اثرات، گھر، اسکول، مدرسہ اور کھیل کے میدان میں خوف، نیز معاشرتی و سماجی زندگی کے زیراثر پیدا ہونے والے خوف اور ذرائع ابلاغ کا غیرمحتاط رویہ وغیرہ زیربحث آئے ہیں۔ مصنفہ کے نزدیک بچوں میں خوف پیدا کرنا ایک اخلاقی جرم اور سنگین غلطی ہے جس سے بچے کی پوری زندگی متاثر ہوسکتی ہے، لہٰذا اسے معمولی بات نہ سمجھا جائے۔ بچوں کی تربیت کی بنیاد دین کی تعلیمات پر ہونی چاہیے۔ بچوں کی نفسیات اور حکمت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی کام سے روکنا یا سختی برتنی چاہیے۔ بحیثیت مسلمان اللہ پر ایمان خوف کو دُور کرسکتا ہے اور والدین کو ہرممکن طریقے سے بچوں کا خوف دُور کرنا چاہیے۔ ضرورت پڑنے پر ماہرنفسیات سے بھی رجوع کرنا چاہیے۔ والدین، اساتذہ کرام اور بچوں کی تربیت کے لیے ایک مفید اور عام فہم کتاب۔ (امجد عباسی)

مدیر کے نام

احمد علی محمودی ،حاصل پور

پروفیسر خورشید احمد نے مولانا ابوالکلام محمد یوسفؒ (مارچ ۲۰۱۴ء) جیسی ایک ایسی ہستی پر قلم اُٹھایا جن کی زندگی کا ہر ہر لمحہ تحریکِ اسلامی کے کارکنان کے لیے مشعلِ راہ اور مینارۂ نور رہے۔ درست توجہ دلائی گئی ہے کہ پاکستان کی پارلیمانی تاریخ میں جماعت اسلامی کے نمایندوں نے جو کردار ادا کیا ہے، اسے سامنے لایا جانا چاہیے۔

عمران ظہور غازی ،لاہور

'پاکستانی کلچر کے سرچشمے یا عبرت کدے؟' (مارچ ۲۰۱۴ء) ثقافت کے موضوع پر اہم تحریریں ہیں۔ تنوع نے طوالت کو محسوس نہ ہونے دیا۔ ترجمان میں اس طرح کے زندہ موضوعات پر قلمی مذاکرے کی روایت کا آغاز کریں اور اہلِ علم سے لکھوائیں۔ اس سے جہاں ترجمان میں دل چسپی بڑھے گی وہاں تحریک کا موقف بھی سامنے آسکے گا۔

دانش یار ،لاہور

اس ماہ عالمی ترجمان القرآن میں دو مضامین بہت خوب رہے۔ یہ جو ایک سیمی نار آپ نے منعقد کر دیا، یعنی 'پاکستانی کلچر کے سرچشمے یا عبرت کدے'، اس نے ایک پُر لطف مجلس میں شرکت کا لطف دیا۔ دوسرا مضمون 'ایمان و وفا' حضرت زینبؓ کے حوالے سے بہت ہی روح پرور تحریر ہے۔

خالد محمود ،بھلوال

'مطالعے کی عادت ــــــ ایک تحریکی زاویہ' (مارچ ۲۰۱۴ء) میں تحریکی نقطۂ نظر سے مطالعے کی اہمیّت وضرورت اور افادیت کو بخوبی اُجاگر کیا گیا ہے۔ تحریکی لٹریچر کے علاوہ جدید افکار سے باخبر رہنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ اگر اس ضمن میں کچھ موضوعات اور کتب کی طرف بھی رہنمائی دے دی جاتی تو زیادہ مفید ہوتا۔

فراز احمد سلیم ،گوجرانوالہ

'ایمان و وفا' (مارچ ۲۰۱۴ء) کے زیرعنوان بنت رسولؐ حضرت زینبؓ کا تذکرہ پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ عبدالغفار عزیز اُمت مسلمہ کے احوال سے تو باخبر کرتے ہی ہیں لیکن سیرت کے موضوع پر بھی خوب لکھتے ہیں۔ اس حوالے سے مزید تحریروں کا انتظار رہے گا!

عبدالرشید کلیر ،وزیر آباد

'قبولِ اسلام اور دعوت کی تڑپ' (فروری ۲۰۱۴ء) میں فاطمہ (سابقہ لکشمی بائی) نے جس جذبے اور تڑپ سے اہلِ خانہ کو دعوتِ دین دی اور تکالیف اُٹھائیں اس سے جذبہ ملتا ہے۔ اپنا جائزہ لے کر شرمندگی بھی ہوتی ہے کہ ہم دعوت کے لیے کتنی تگ و دو کرتے ہیں۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا اور ہم نے متعدد شمارے منگوا کر تقسیم کیے۔

توسیعی منصوبہ الخدمت ہسپتال اورنگی ٹاؤن

سابق ناظم کراچی نعمت اللہ خان کی اپیل

محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الخدمت ہسپتال اورنگی ٹاؤن گذشتہ 15 سال سے ایشیا کی سب سے بڑی کچی آبادی اورنگی ٹاؤن اوراس کے ملحقہ آبادیوں، سائٹ اور بلدیہ میں لوگوں کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس وقت اس ہسپتال میں میٹرنٹی ہوم، آئی فیکو سرجری، ڈینٹل کے شعبہ جات کام کررہے ہیں نیز 26 کنسلٹنٹ اپنی خدمات انجام دیتے ہیں، علاقے کی سب سے جدید لیبارٹری موجود ہے۔ اوسطاً روزانہ پانچ سو مریض مستفید ہورہے ہیں، مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور مزید سہولیات فراہم کرنے کے لئے اس کے توسیعی منصوبے کے تعمیراتی کام کا آغاز کررہے ہیں۔ اس منصوبے پر اندازاً دس کروڑ روپے کا تخمینہ ہے۔ ان شاءاللہ تعمیر مکمل ہونے کے بعد یہ ہسپتال علاقے کا جدید ترین ہسپتال ہوگا۔ جس میں تمام سہولیات فراہم ہونگی۔

محترم خواتین وحضرات اس وقت بھی آپ کے دیئے ہوئے عطیات سے خدمت انجام دے رہا ہے۔ اور مجھے امید ہے اس منصوبے کی تکمیل تک آپ کا تعاون جاری رہے گا۔ (ان شاءاللہ)

ملتمس

نعمت اللہ خان
سابق سٹی ناظم کراچی
سابق صدر الخدمت فاؤنڈیشن

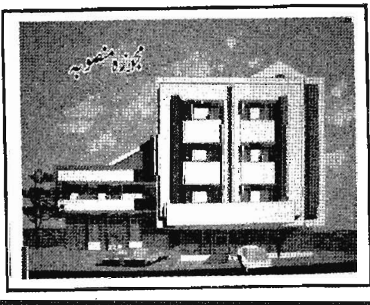
برائے رابطہ

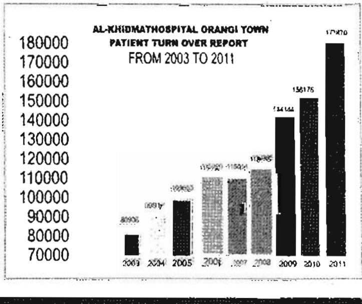
محمد اسحاق خان
امیر جماعت اسلامی ضلع غربی کراچی
وسرپرست اعلیٰ الخدمت ہسپتال
موبائل نمبر۔ 03332205538

عزیر بیگ قاسمی
نائب امیر جماعت اسلامی ضلع غربی کراچی
وگران الخدمت ہسپتال
موبائل نمبر۔ 0301-2863828

محمد لئیق خان
ایڈمنسٹریٹر الخدمت ہسپتال/EX-MNA
موبائل نمبر۔ 0300-9240133

آن لائن اکاؤنٹ
نیشنل بینک آف پاکستان اورنگی
برانچ کوڈ۔ 1055 اکاؤنٹ نمبر۔ 4-1042

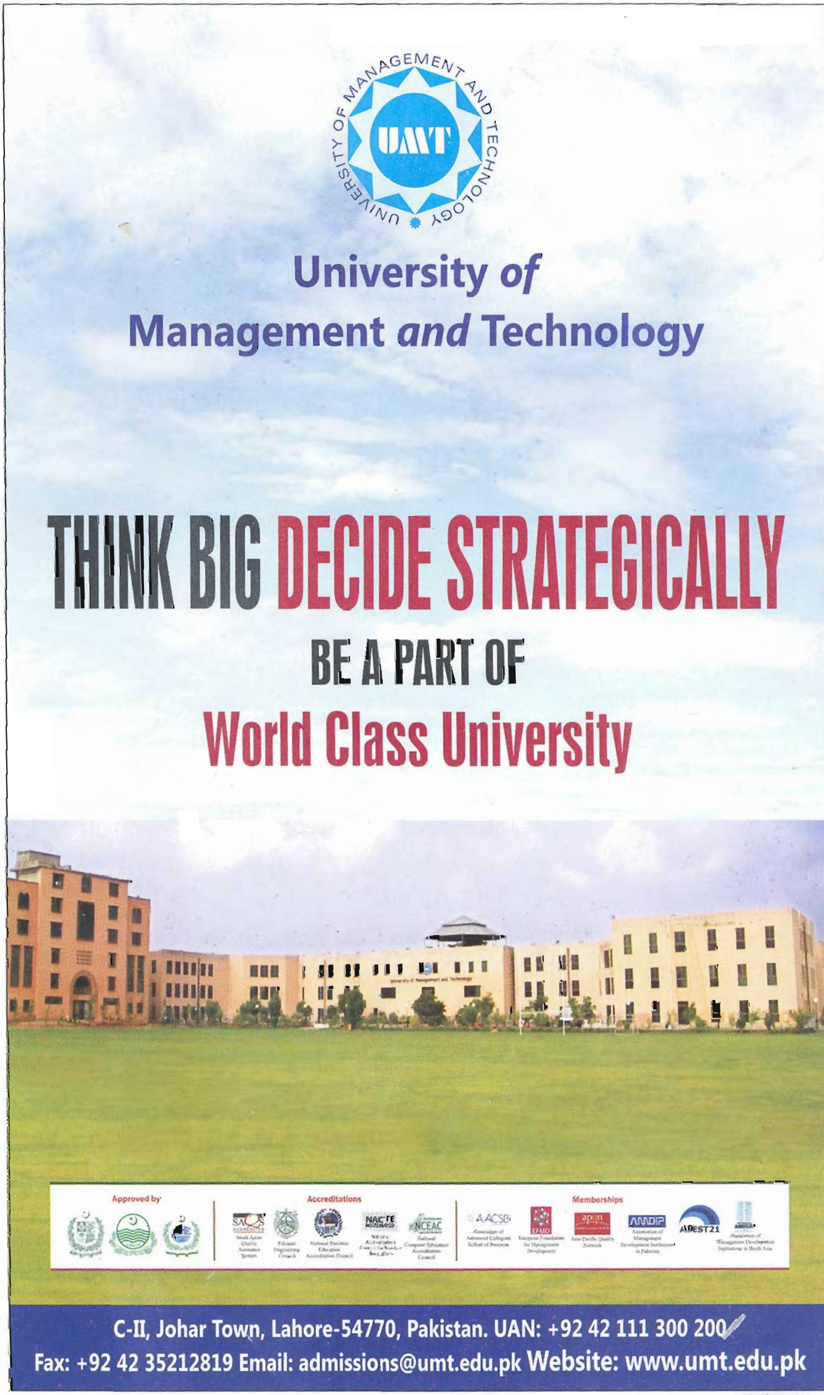




email: alkhidmathospitalorangi@gmail.com | Ph : 0213-6668893

مرزا محمد الیاس نے ارقم آفاق پرنٹر، بلال گنج سے چھپوا کر اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔


ESTD. 1952
AHMED
FOODS
PRODUCT OF ISLAMIC REPUBLIC OF PAKISTAN
Taste of Every Season
Ahmed Foods Mixed Pickles are famous around the world for infusing extra bit of flavor in your every day meals.
Used as an appetizer or an added ingredient to enhance our taste buds during eating, our pickles are made from fresh fruits & vegetables; preserved in salt, vegetable oil and vinegar with spices to retain the original flavor.
AHMED
FOODS
MIXED
PICKLE IN OIL
AHMED
FOODS
MIXED
Pickle in Oil
Nature Produces taste AHMED Preserves It!


University of Management and Technology
UMT
University of
Management and Technology
THINK BIG DECIDE STRATEGICALLY
BE A PART OF
World Class University
Approved by
Accreditations
Memberships
C-II, Johar Town, Lahore-54770, Pakistan. UAN: +92 42 111 300 200
Fax: +92 42 35212819 Email: admissions@umt.edu.pk Website: www.umt.edu.pk